غالب اور رام پور

مرتب

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

غالب اور رام پور

مرتّب:

شاہد ماہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

Ghalib Aur Rampur
Edited By :
Shahid Mahuli

ISBN 81-8172-014-8

اہتمام	:	شاہد ماہلی (ڈائرکٹر، غالب انسٹی ٹیوٹ)
اشاعت	:	۲۰۰۶ء
قیمت	:	۱۵۰/روپے
مطبوعہ	:	اصیلا آفسٹ پریس، دہلی
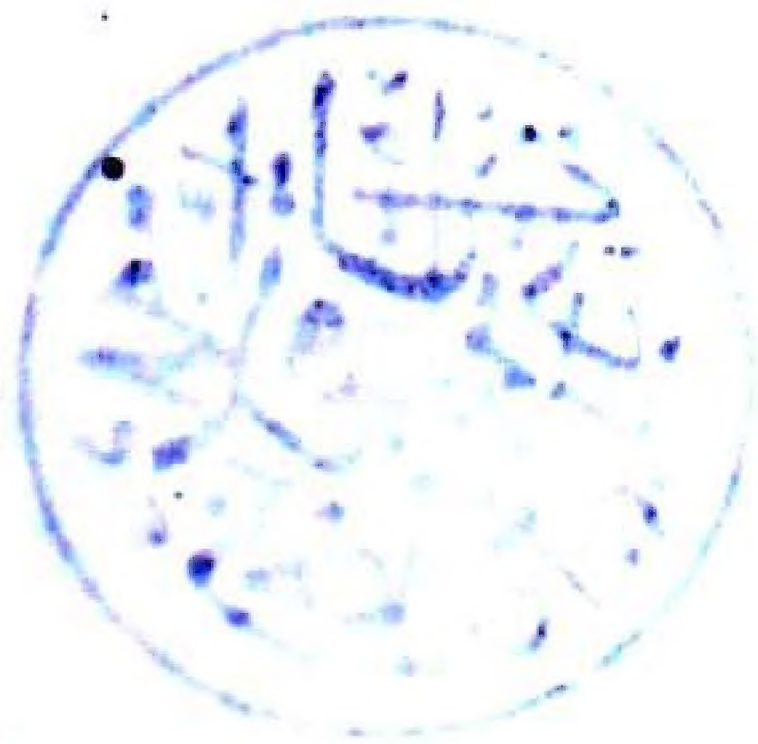
غالب انسٹی ٹیوٹ،
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ـ ۲
www.ghalibinstitute.com– email: ghalib@vsnl.net

ترتیب

پیش لفظ

غالب انسٹی ٹیوٹ کی یہ کوشش ہے کہ غالبؔ نے جن شہروں میں قیام کیا ہے اُن شہروں میں جا کر غالب کو یاد کیا جائے۔ لہٰذا ہم نے آگرہ، رام پور اور کلکتہ میں سمینار کے ذریعے غالب کی شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ غالب کا قیامِ رام پور علمی، ادبی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے کافی اہم ہے لہٰذا غالب انسٹی ٹیوٹ نے رام پور میں دو دنوں کا ایک سمینار منعقد کیا جس میں مقتدر غالب شناسوں نے شرکت کی اور غالب کی زندگی اور شہر رام پور سے متعلق کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔ اس کتاب میں وہ تمام مضامین شامل ہیں جن کے مطالعہ سے ہمیں غالب، عہدِ غالب اور رام پور کو جاننے اور سمجھنے میں کافی مدد ملی ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور پروفیسر شریف حسین قاسمی کے مضامین نہ صرف اہلِ رام پور سے غالب کے ادبی، سیاسی اور معاشی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ رام پور کی علمی اور ادبی حیثیت پر بھی اہم گوشے اور اشارے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ابنِ فرید کا مضمون ''رامپور میں اردو کا فروغ''

شمس بدایونی کا مضمون ''دیوانِ غالب کا ایک مشہور رامپوری نسخہ''۔ ''غالب کے تلامذہ رام پور صلاحِ سخن کے حوالے سے'' کے عنوان سے ڈاکٹر اسلم پرویز کی تحریر بھی ہمیں دعوتِ غور و فکر دے رہی ہے۔ اس موقع پر وقارالحسن صدیقی صاحب او۔ ایس۔ ڈی رضا لائبریری رام پور کے مشکور ہیں جن کے تعاون سے ہم نے رام پور جیسے تاریخی مقام میں غالب کو یاد کیا اس کتاب میں ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی صاحب کا مضمون بھی شامل ہے جو غالب اور رام پور کے حوالے سے کافی علمی ہے۔ علمی اور ادبی حلقے میں اس کتاب کا کافی دنوں سے انتظار تھا ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب اہلِ علم کے لیے ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہوگی اور اسکا شمار غالبیات کی اہم کتابوں میں ہوگا۔

شاہد ماہلی

سیدامیر حسن عابدی

رامپور کی یادیں

میں ان خوش قسمت لوگوں میں ہوں جنہوں نے نواب حامد علی خاں مرحوم کو دیکھا ہے۔ میں ابتدائی کلاسوں میں تھا کہ نواب صاحب لکھنؤ مدرسۃ الواعظین میں تشریف لائے۔ ہم لوگ صرف دروازہ پر کھڑے ہو کر ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ابھی حال میں ''مسیرِ حامدی'' نام کی کتاب کی پہلی جلد نظر سے گذری، جو غالباً مولانا فرخی نے جو نواب صاحب کے فارسی کے استاد تھے، ان کی طرف سے لکھی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نواب صاحب نے اپنی جوانی میں پوری دنیا کا سفر کیا تھا نیز ان کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ لنکا کے متعلق لکھتے ہیں: ''آدمی، حقیر، پستہ قد، قلیل الحبثہ، جن کے دیکھنے سے یقین ہوتا ہے کہ رام چندر جی نے بیسواڑے کے راجپوت اور گونڈ بھیل وغیرہ کے لشکر سے بہت آسانی کے ساتھ اس ملک کو فتح کیا ہوگا''[1]۔ لکھتے ہیں: ''یورپ میں ؟؟ کی طرز اور کھانے کے تکلفات فرنچ سے ایجاد ہوتے ہیں، جیسا کہ ہمارے ملکوں میں اکثر کھانے وغیرہ ایران کے ایجاد کئے ہوئے ہیں''[2]۔

پھر آگے بڑھ کر کہتے ہیں: ''ہمارے ملک کے آدمی... تمام دنیا کو اپنے مقابلہ میں وحشی سمجھے ہیں، مگر.. کسی چھوٹے سے ملک کے بھی پاسنگ نہیں ہیں۔

ناز ہے گُل کی نزاکت پر چمن کو اس ذوق
اِس نے دیکھے بھی نہیں ناز ونزاکت والے

جاپان کے متعلق لکھتے ہیں:

''شہنشاہ کی ایک ملکہ اور ۱۲ خواصیں، جن کو پسند کر کے نوکر رکھ لیتے ہیں..ان دو قسم کے سوا تیسری قسم کی بھی ہوتی ہے، جو باہم تعشق کے بعد بغیر نکاح کے ساتھ ہو جاتی ہے... کسی شہنشاہ کے گھر ملکہ سے اولاد نہیں ہوتی ہے[۵]۔''

اس سفر میں نواب صاحب کے ساتھ مولوی فرخی، عبدالصمد خاں، مسٹر بٹرن، مسٹر ہوس، کرنل رنڈل وغیرہ تھے۔

آج رام پور میں جتنی بڑی اور عمدہ عمارتیں ہیں، سب انہیں کی بنوائی ہوئی ہیں۔ عمارتوں کے علاوہ نواب صاحب کو مذہبی لگاؤ بھی تھا۔ مولانا سید ظہور حسین صاحب اپنے زمانہ کے بہت بڑے فلسفی تھے۔ میں نے انہیں لکھنؤ میں بارہا دیکھا اور ان کی خدمت میں ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے رہا ہوں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب کے استاد ڈاکٹر جعفر حسین ندوی سب سے پہلے انگلینڈ سے عربی میں .Ph.D کی ڈگری لائے تھے۔ انہیں مولانا ظہور حسین کے شاگردوں میں تھے۔ شروع میں مولانا رام پور میں نواب صاحب کے صاحبزادوں کے استاد کی حیثیت سے رہے تھے۔ نیز نواب صاحب کی فرمائش پر آپ نے ''جامع حامدی'' کئی جلدوں میں لکھی، جو مطبع سرکار عالیہ رام پور سے شایع ہوئی ہے۔ اس کی پہلی جلد میں توحید اور دوسری میں عدل ہے۔ تیسری جلد کے دو حصے ہیں: ایک نبوت مطلقہ دوسرا نبوت خاصّہ ۔ میری نظر سے صرف نبوت والی ایک جلد گذری ہے۔ نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم کے بعد ان کے جانشیں نواب علی خاں صاحب نے اِس شہر کی رونق میں

اضافہ کیا جس میں کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کو بڑا دخل رہا ہے۔ نواب صاحب کو موسیقی سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور ہندوستان کے بڑے بڑے موسیقی والے ان کے نمک خوار رہے ہیں اس کے علاوہ رامپور رضا لائبریری آپ کی دین ہے، جس سے دنیا کے مستشرقین استفادہ کر رہے ہیں، نیز دولت چند اور مرحوم پروفیسر نور الحسن صاحب نے اس کی رونق میں اضافہ کیا ہے۔ خوش قسمتی سے اس کتب خانے کو امتیاز حسین عرشی صاحب جیسا کتابدار مل گیا، جس نے اسے پوری طرح سے چھانا اور مطالعۂ غالب کے سلسلہ میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

رام پور کے ذکر میں مدرسہ عالیہ کا ذکر بھی ضروری ہے، جہاں بڑے بڑے علما نے درس و تدریس سے ممتاز ذہنوں کی تربیت کی ہے۔ میرے ایک عزیز مولانا داؤد صاحب مرحوم، نواب صاحب، مولانا عبدالسلام وغیرہ کے استاد اور مدرسہ عالیہ کے پرنسپل رہے ہیں۔ مولانا شاداں بلگرامی اتنے بڑے استاد تھے کہ ان کے بہت سے شاگرد اپنے کو شادانی لکھتے ہیں۔ عندلیب کے والی وغیرہ یہیں کی پیداوار ہیں۔

۱۹۴۳ء میں پہلی مرتبہ آگرہ یونیورسٹی میں ۵ ریسرچ اسکالرشپ کی شروعات ہوئی۔ نیز ایک وظیفہ مجھے ملا۔ میرے استاد مرحوم حامد حسین قادری تھے، جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وغیرہ کے بھی استاد رہے تھے۔

سینٹ جانس کالج کے پرنسپل Condn T. D. Sully نے میرے لئے ایک خط کرنل زیدی چیف منسٹر کو لکھا اور میں خاص باغ میں شاہی مہمان بن گیا۔ کئی ہفتہ؟؟ ریاست کے تانگہ میں قلعہ میں جاتا، دن بھر کام کرتا اور کبھی کبھی پیدل واپس آتا۔ واپسی میں اکثر اس مکان سے گذر ہوتا جہاں غالب رہا کرتے تھے۔ سنگ مرمر پر ایک کتبہ تھا جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ اب اس کا کیا حشر ہوا مجھے اس کا علم نہیں۔ مقصد ہے کہ اب وہ کتبہ وہاں نہیں ہے، نیز وہ مکان کسی نے خرید لیا ہے۔

نواب رضا علی خاں کو قرآن کی تفسیر کی فکر ہوتی، تو علما کو سید ھے مہمان خانہ میں

جمع کردیا۔ نیز اس کے نتیجہ میں میرے استاد علامہ مرحوم کو سپرد یہ کام کیا گیا۔

میں ۱۹۴۵ء سے برابر دہلی سے اس کتب خانے سے استفادہ کے لئے آتا رہا۔ میرے ایک ماموں یہاں ماسٹر تھے، ان کے ساتھ قیام کرتا تھا، ۱۹۴۷ء کے فسادات کے وقت رام پور اسپیشل میں بیٹھ کر دہلی سے نکلا۔

خوشی ہے کہ اس وقت ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی اس کتب خانے کے کرتا دھرتا ہیں۔ ان کے زمانے میں برابر آتا اور سمیناروں میں شرکت کے علاوہ قلمی کتابوں سے استفادہ کرتا ہوں۔ ابھی حال میں ایک سمینار میں شرکت کے لئے آیا تھا اور وقت نکال کر دیوان جمیل خشی، دیوان رضا اصفہانی اور دیوان مشہدی کا مطالعہ کیا۔ نیز ان پر مقالے لکھے جو عنقریب شایع ہوں گے۔ کتنے بڑے افسوس کی بات ہے کہ دیوان نظیری آج تک ہندوستان میں مرتب اور ایڈٹ ہو کر شایع نہیں ہوا۔ جبکہ وہ زیادہ تر ملک میں رہے نیز ان کے بے شمار قلمی نسخے۔ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ خود رام پور میں ان کے بہت سے نسخوں سے ان کا وہ کلام نکالا جا سکتا ہے، جو اب تک منظر عام پر نہیں آیا۔ میں اب تک ان کی کئی غزلیں اور ایک ترجیع بند شایع کر چکا ہوں۔

ابھی حال میں مجھے اس لائبریری سے ایک Felloship دیا گیا اور میں نے شاہجہان، شمشیر خانی، کو ایڈٹ کرنا شروع کیا۔ اس کے بے شمار قلمی نسخے موجود ہیں، نیز وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ رجب علی سرور نے واجد علی شاہ کی فرمایش پر اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ نیز انگریزی میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ مگر بدقسمتی سے صرف ایک سال کے بعد fellowship روک دی گئی، جس سے کام ناقص شکل میں موجود ہے۔

سب سے آخر میں میں مرحوم عظمت علی رضوی صاحب کا ذکر کروں گا۔ جو دہلی میں چاوڑی بازار میں ایک پریس چلاتے اور میری سرپرستی میں مجلّہ "آہنگ" نکالتے تھے۔ بعد میں وہ رام پور واپس آگئے اور یہاں سے پریس کے ساتھ ساتھ رسالہ نکالتے رہے۔

میں اگر آتا تو انہیں کے ساتھ قیام کرتا تھا۔

۱۔ ۱۸۸۹۔ ۱۹۳۰ء
۲۔ مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۳ء
۳۔ ص ۸۲
۴۔ ص ۷۲
۵۔ ص ۷۶
۶۔ ص ۱۲۴
۷۔ ۱۹۳۵۔ ۱۹۶۶
۸۔ ۱۸۴۷۔ ۱۸۵۶

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

پچھلی نصف صدی میں ہندوستان کے عربی، فارسی کے جن دانشوروں کو ہندوستان سے باہر کی علمی دنیا میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور جن کے علمی اور ادبی کارناموں کا اعتراف کیا گیا ہے، ان میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر امیر حسن عابدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

عرشی صاحب مرحوم کو عرب دنیا میں اور نذیر صاحب کو ایران میں بہت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مجھے ان تینوں بزرگوں سے قربت کا فخر حاصل ہے۔ یہ حضرات میرے نہ صرف بزرگ بلکہ معنوی استاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عرشی صاحب سے میری پہلی ملاقات تیس، چالیس سال پہلے رام پور میں اُن دنوں ہوئی تھی، جب میں اور اسلم پرویز دہلی کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) سے اردو میں ایم۔اے کررہے تھے۔ رام پور میں تقریروں کا مقابلہ تھا، جس میں شرکت کے لیے دہلی کالج سے میں اور اسلم پرویز گئے تھے۔ ہم لوگ ایک دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ شام کو ایک نوجوان بہت ہی خوب صورت دبلا پتلا، گندمی رنگ، لمبے لمبے خوب صورت بال، بڑی بڑی

آنکھیں، چوڑا ماتھا اور دلکش شخصیت کے مالک ،ہم سے ملنے مہمان خانے میں آئے۔اُنھوں نے اپنا نام بتایا اکبر علی خاں۔ہم لوگ بہت جلد بے تکلف ہو گئے اور بہت دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔معلوم ہوا کہ اکبر علی خاں کو فارسی پر اچھی قدرت حاصل ہے اور وہ اردو میں شاعری کے ساتھ ساتھ تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔اُنھوں نے اپنے تھیلے میں سے ایک بیاض نکالی اور لگ بھگ پونے گھنٹے تک ہمیں اپنا کلام سنایا۔میں نے ہمیشہ ہی شاعروں کی صحبت سے گریز کیا۔کیوں کہ اُن کا کلامِ بلاغت نظام سننے کے لیے جس ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ مجھ میں پہلے تھی اور نہ اب ہے۔مگر پردیس میں ہونے کی وجہ سے ہمیں اکبر علی خاں صاحب کو بڑی سنجیدگی اور توجہ سے سننا پڑا۔مرحوم کو شعر کہنے کا سلیقہ آتا تھا۔وہ بہت اچھے شعر کہتے تھے۔اگر وہ اپنی پوری توجہ شاعری ہی پر صَرف کرتے تو یقیناً ہمارے زمانے کے اچھے شاعروں میں اُن کا شمار ہوتا۔خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔اکبر صاحب جب رخصت ہونے لگے تو اُنھوں نے مجھے اور اسلم صاحب کو دوسرے دن شام کو اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ہمارے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔کیوں کہ اس سے پہلے ہمیں کسی نے کھانے پر نہیں بلایا تھا۔اس لیے ہم فوراً راضی ہو گئے۔دوسرے دن شام کو تقریریوں کا مقابلہ ہوا۔آگے کی صف میں ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔پینتالیس پچاس سال کی عمر،اُنھیں دیکھ کر مجھے اپنے خاندان کے ایک بزرگ یاد آگئے۔جب میں بچہ تھا تو افغانستان سے ہمارے ایک رشتے دار پہلی بار ہم لوگوں سے ملنے کے لیے ہندوستان آئے، وہ اصل پٹھان تھے۔کیسی باوقار شخصیت تھی۔میں تو اُنھیں دیکھتا ہی رہ گیا! بڑی باوقار شخصیت تھی اُن کی۔ تقریریوں کے مقابلے میں جو صاحب اگلی صف میں بیٹھے تھے، وہ بالکل ہمارے خاندان کے اُن بزرگ سے بہت ملتے جلتے تھے۔بالکل وہی حلیہ، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ حضرت مولانا امتیاز علی خاں عرشی ہیں۔ہم اُن کے ادبی کارناموں سے واقف نہیں تھے۔کیوں کہ ادب میں ہم اپنے عہد کے صرف

شاعروں، ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں ہی سے واقف تھے۔ ہمیں اس کا قطعی علم نہیں تھا
کہ عرشی صاحب کو علمی دنیا میں اتنا بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ بڑی بڑی روشن اور چمک دار
آنکھیں، لمبی ناک، چوڑا ماتھا، شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ تنگ مہری کا پاجامہ۔ سیدھی باڑ کی
ٹوپی لگائے ہوئے تھے۔ پوری محفل میں وہ سب سے الگ تھے۔ میری نظریں اُنھیں پر جمی
ہوئی تھیں، جس کی ایک وجہ تو عرشی صاحب کی پُر وقار شخصیت اور دوسرے یہ کہ وہ اوپر سے
نیچے تک بالکل میرے اُن رشتے دار کی تصویر بنے ہوئے تھے جو میرے بچپن میں ملنے کے
لیے افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جو میرے عزیز تھے، اُن کے
سر پر پگڑی تھی ، وہ کوٹ اور شلوار پہنے ہوئے تھے اور عرشی صاحب ٹوپی اور
شیروانی۔ دوسرے دن ہم اکبرعلی خاں صاحب کے یہاں کھانے پر گئے تو عرشی صاحب
وہاں موجود تھے۔ وہاں ہمیں معلوم ہوا کہ عرشی صاحب اکبر صاحب کے والد ہیں۔ جس
محبت، خلوص اور پیار سے عرشی صاحب ہم سے ملے، میرے ذہن پر اُس کے اثرات آج
تک برقرار ہیں۔ ہم لوگوں نے کھانا ایک ساتھ کھایا اور کھانے کے دوران وہ باتیں کرتے
رہے۔ بہت ہی نرم اور دھیمے لہجے میں۔ میرے خاندان کے بارے میں معلومات
کیں۔ جب اُنھیں معلوم ہوا کہ میرا خاندان تین چار پشت پہلے رام پور سے تعلق رکھتا تھا تو
وہ بہت خوش ہوئے۔ اُنھوں نے میرے رامپوری بزرگوں کا نام پوچھا۔ مجھے صرف ایک ہی
نام یاد تھا اور وہ تھا بڈّے خاں۔ میرے خاندان کی روایت کے مطابق ہمارے پردادا ان ہی
بزرگ کی غیر قانونی حرکتوں کی وجہ سے رام پور چھوڑ کر دہلی آئے تھے۔ میں نے جب وہ نام
بتایا تو عرشی صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ جناب! وہ تو بہت بڑے شہدے تھے۔ میں
اس فقرے سے بہت نروس ہو گیا لیکن فوراً بات کو سنبھالتے ہوئے میں نے کہا کہ اُن کے
شہدے پن ہی کی وجہ سے تنگ آکر تو ہمارے پردادا دہلی آئے تھے۔ اس کے بعد عرشی
صاحب نے کچھ ادبی گفتگو چھیڑ دی اور اس موضوع پر بہت دیر تک بات کرتے رہے۔ ہم

لوگ گفتگو میں مصروف تھے اور اکبر علی خاں بے چارے ہم لوگوں کو کھانا کھلانے میں لگے رہے اور جب ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا تو وہ ایک خاموش سامع کی حیثیت سے بیٹھے رہے۔ اکبر اپنے والد کا بہت احترام کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک یہ صحبت بہت دل چسپ رہی۔ ہاں! یہ بتانا بھول گیا کہ عرشی صاحب نے اسلم پرویز اور میری تقریروں کی تعریف کی اور کچھ مشورے بھی دیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُن کا ایک مشورہ یہ تھا کہ آپ بہت تیز اور اونچی آواز میں بولتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ذرا ہلکے انداز میں بولیں تاکہ لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کر سکیں۔ دوسرے دن ہم دہلی آ گئے لیکن عرشی صاحب کی شخصیت دل و دماغ پر چھائی رہی۔

مجھے دہلی یونی ورسٹی نے پی ایچ ڈی کے لیے مرزا مظہر جان جاناں کا موضوع دیا۔ مجھ پر یہ موضوع اس انداز سے تھوپا گیا تھا کہ میرے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔ میں مرزا محمد رفیع سودا پر کام کرنا چاہتا تھا۔ مگر مرزا مظہر جان جاناں پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر مجبور تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں اور مرزا محمد رفیع سودا کا ایک ہی زمانہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مرزا مظہر جان جاناں سودا سے عمر میں بڑے تھے لیکن تھے دونوں ہم عصر۔ میں نے ایک کام یہ کیا کہ مرزا مظہر کے ساتھ سودا پر بھی تحقیق شروع کر دی۔ ہندوستان کی جن لائبریریوں میں، میں اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں جاتا تھا، وہاں مرزا مظہر جان جاناں کے ساتھ سودا پر بھی نوٹس لے لیتا تھا۔

دہلی یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ یونی ورسٹی میں پیش کرنے کے بعد میں نے سودا پر کتاب لکھنی شروع کر دی۔ ابھی چار پانچ چیپٹرز ہی لکھے تھے کہ پروفیسر آل احمد سرور سے میری ملاقات ہوگئی۔ اُنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔ میں نے اپنے سودا کے پروجیکٹ کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ نے جہاں تک لکھ لیا ہے وہ ذرا مجھے دکھا دیجیے۔ میں نے دو تین دن میں ڈاک سے شروع کے

تین چار ابواب سرور صاحب کو بھیج دیے۔ یہ سرور صاحب کا کرم اور نوازش تھی کہ اُنھوں نے فوراً تحریر فرمایا کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو انجمن ترقی اردو یہ کتاب چھاپنے پر غور کر سکتی ہے۔ اگر آپ کو میری تجویز منظور ہے تو یہ کتاب جلد سے جلد مکمل کر دیجیے۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میں نے لگ کر چھ سات مہینے میں یہ کام مکمل کر کے مسودہ سرور صاحب کو بھیج دیا۔ ایک دو مہینے بعد سرور صاحب کا خط آیا کہ ادبی کمیٹی نے میری کتاب منظور کر لی ہے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو اس کا ایکسپرٹ مقرر کیا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ میں عرشی صاحب کے ادبی معیار پر شائد پورا نہ اُتر سکوں۔ اس لیے مجھے خدشہ تھا ایسا نہ ہو کہ عرشی صاحب میرا مقالہ نامنظور کر دیں۔ بہر حال کچھ دن بعد عرشی صاحب کا خط آیا۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ انجمن ترقی اردو نے میرا مقالہ رائے کے لیے اُن کے پاس بھیجا ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی لکھا کہ محض خط لکھنے سے تو بات نہیں بنے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی دن آپ رام پور آ جایئے۔ آپ ہمارے ساتھ قیام فرمایئے۔ ہم اس کتاب کے بارے میں بات کر لیں گے۔ اب مجھے اور زیادہ پریشانی ہوگئی۔ مَیں نے سوچا کہ وُہ میرا مسودہ نامنظور کریں گے اور مجھے تسلّی دینے کے لیے بلایا ہے۔ بہر حال میں رام پور پہنچ گیا۔

چوں کہ مرزا مظہر جان جاناں اور مرزا محمد رفیع سودا کے موضوعات پر کام کرتے ہوئے میں کئی بار رضا لائبریری (رام پور) گیا تھا اور وہاں عرشی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس لیے اب میں اُن کی ادبی حیثیت سے واقف ہو چکا تھا۔

عرشی صاحب نے مہمان خانے میں میرے قیام کا انتظام کر رکھا تھا۔ جب میں پہنچا تو شام کا وقت تھا۔ لائبریری بند ہوگئی تھی۔ میں نے چوکیدار کو بتایا کہ دہلی سے آیا ہوں اور عرشی صاحب نے مجھے بلایا ہے۔ عرشی صاحب اُسے پہلے ہی ہدایت دے چکے تھے وہ فوراً مجھے مہمان خانے میں لے گیا اور مجھ سے کہا کہ آپ نہا دھولیں، میں چائے لے کر آتا ہوں۔ میں جب نہا دھو کر باہر آیا تو چائے رکھی ہوئی تھی۔ چائے پی چکا تو وہ چوکیدار مجھے عرشی

صاحب کے دولت کدے پر لے گیا۔ عرشی صاحب لان میں بچھی ہوئی تین کرسیوں میں سے ایک کرسی پر تشریف رکھتے تھے اور دوسری خالی تھی۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور میرے استقبال کے لیے کئی قدم آگے آئے، ہاتھ ملایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گئے اور مجھے دوسری کرسی پر بٹھا دیا۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد اُنھوں نے بتایا کہ اکبر علی خاں کچھ دیر کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔ گویا اُنھیں اس کا احساس تھا کہ مجھے اکبر علی خاں سے ملاقات کی فکر ہوگی۔ کچھ دیر میں اکبر علی خاں صاحب بھی آگئے اور عرشی صاحب اُٹھ کر زنان خانے میں چلے گئے۔ بہت دیر تک میں اور اکبر باتیں کرتے رہے اور پھر اُنھوں نے میز پر کھانا لگایا اور اندر سے ایک کرسی اور لے آئے۔ جب کھانا لگ گیا تو وہ عرشی صاحب کو بھی بلا لائے۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ کیا کھانا تھا یہ تو مجھے یاد نہیں۔ ہاں یہ یاد ہے کہ بہت مزے کا تھا۔ کھانے کے بعد عرشی صاحب نے کہا کہ کل صبح آپ مجھے لائبریری میں مل لیجیے تو ہم اُس مسودے کے بارے میں بات کریں گے۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں میرا مقالہ رَد نہ کر دیں۔ اپنی خود اعتمادی کی بنیاد پر میں نے پوچھ لیا کہ محترم! میرے مقالے کے بارے میں تفصیل سے گفتگو تو آپ کل فرمائیں گے لیکن آج مجھے صرف یہ بتا دیجیے کہ اُس کے بارے میں بحیثیت مجموعی آپ کی کیا رائے ہے؟ عرشی صاحب میری پریشانی کو سمجھ گئے۔ میرے قریب آئے اور میرا کاندھا تھپکتے ہوئے کہا یہ ایک ایسا کام ہے جو اردو میں آپ کے نام کو زندہ رکھے گا۔ بس اب کل باتیں ہوں گی اور یہ کہہ کر وہ گھر میں چلے گئے۔ اکبر اور میں مہمان خانے میں آگئے، جہاں ہم لوگوں نے دنیا بھر کی باتیں اور شعر و شاعری کی۔ دوسرے دن جب میں لائبریری پہنچا تو عرشی صاحب میرے منتظر تھے۔ میرے پہنچتے ہی اُنھوں نے چپڑاسی سے چائے لانے کو کہا اور پھر اُنھوں نے میرا مسودہ کھول کر وہ مقامات نکالے، جہاں اُنھوں نے نشان لگا رکھے تھے۔ میں نے ایک دو جگہ حوالے دینے میں غلطی کی تھی، کہیں عبارت میں کچھ

فرق ہو گیا تھا اور کہیں کتاب کا حوالہ ٹھیک سے نہیں دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ خانِ آرزو کے تذکرے 'مجمع النفائس' کا جو میں نے حوالہ دیا تھا، اُسے نقل کرنے میں اُس کے متن میں غلطیاں ہو گئی تھیں۔ عرشی صاحب نے لائبریری سے دو تین کتابیں منگوا کر اپنی میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے 'مجمع النفائس' میں ایک جگہ پر کاغذ رکھا ہوا تھا، اُسے نکال کر اُنھوں نے بتایا کہ آپ سے عبارت نقل کرنے میں کچھ سہو ہوا ہے۔ اس کو آپ ذرا درست کر لیجیے۔ اسی طرح دو تین اور کتابوں کے حوالوں کی تصحیح کی۔ اس وقت ایک دل چسپ بات ہوئی اور یہاں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ان میں کیسی قوت برداشت تھی اور وہ نوجوان نسل کی رائے کا کیسا احترام کرتے تھے۔ میں نے مرزا مظہر جانِ جاناں کا جہاں کہیں ذکر کیا، اُن کا صرف نام لکھا تھا، نام کے ساتھ احتراماً حضرت یا اسی طرح کا کوئی القاب نہیں لکھا تھا۔ عرشی صاحب نے فرمایا کہ دیکھیے یہ اپنے زمانے کے بہت بڑے صوفی بزرگ تھے، اُن کے ساتھ آپ کو حضرت تو لکھنا ہی چاہیے۔ اس زمانے میں میری عمر وہ تھی، جس عمر میں نوجوان کو اپنے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہوتی ہیں اور وہ کسی کو اپنے سامنے کچھ نہیں سمجھتا۔ میں عرشی صاحب کا دل و جان سے احترام تو کرتا تھا لیکن اُن کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں مرزا مظہر بحیثیت صوفی کے موضوع پر کام کروں گا تو حضرت لگاؤں گا۔ میں نے ایک شاعر پر کام کیا ہے اور شاعر کے ساتھ حضرت یا احترام کا کوئی اور لفظ اس کے مرتبے کو کم کرتا ہے۔ میری دلیل عرشی صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی بلکہ پسند بھی نہیں آئی۔ مگر یہ اُن کی عظمت تھی کہ اُنھوں نے مسکرا کر کہا کہ جیسا آپ مناسب سمجھیں! میرے اس مسودے پر خاصی دیر تک بات کی اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں دہلی آ گیا تو میں نے عرشی صاحب کے مشورے کے مطابق مسودے میں مناسب تبدیلیاں کر دیں۔ عرشی صاحب مرحوم میرے اس کام سے بہت خوش تھے۔ جب کتاب چھپ کر آئی تو میں یہ کتاب لے کر رام پور اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، بے انتہا خوش ہوئے۔ کہنے لگے

کہ اب بھی اگلے زمانے کے لوگ موجود ہیں۔ یہ اخلاق تو نئی نسل میں بالکل ختم ہو گیا ہے۔ بہر حال میں ایک دن رام پور رہا اور عرشی صاحب کی میزبانی کا لطف اُٹھا کر واپس آ گیا۔

عرشی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کبھی کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں اُن کی خدمت میں حاضر تھا تو ایک اور صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے، جنھوں نے ایک پروفیسر کے کسی کام پر اعتراض کرتے ہوئے پروفیسر کی برائیاں شروع کر دیں۔ عرشی صاحب نے فرمایا کہ اگر اُن پروفیسر صاحب نے ایسا کیا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی ایسا کیا ہوگا۔ اُن کی مجبوریوں سے میں اور آپ واقف نہیں ہیں۔ وہ صاحب پھر بھی پروفیسر کے خلاف بولتے رہے۔ عرشی صاحب نے کہا کہ دیکھیے۔ جو باتیں آپ کر رہے ہیں وہ ان پروفیسر صاحب سے براہِ راست کریں تو مناسب ہوگا۔ مجھے آپ یہ سب کچھ بتا کر اپنا اور میرا وقت خراب کر رہے ہیں۔ عرشی صاحب کے لہجے میں اتنی تلخی تھی کہ وہ صاحب سمجھ گئے اور اُنھوں نے موضوع بدل دیا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کبھی عرشی صاحب کے منہ سے کسی کی برائی سنی ہو۔ عرشی صاحب کی جو خوبیاں میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اُن میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مجھ سے اس طرح کی گفتگو کرتے تھے کہ جیسے میں اُن کا ہم عمر ہوں اور علم میں ان کا ہم پلّہ۔ بعض اوقات گفتگو کا انداز ایسا ہوتا تھا، جیسے علم کے معاملے میں میرا مرتبہ اُن سے بلند ہے اور میرے ہی ساتھ نہیں اکثر چھوٹوں کے ساتھ میں نے اُنھیں اسی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

میں نے مرزا مظہر جان جاناں کے فارسی خطوط مرتب کر کے ان کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو، برہان دہلی، میں قسط وار شائع ہو رہا تھا (بعد میں یہ کتابی صورت میں چھپا)۔ عرشی صاحب کا ایک دفعہ خط آیا کہ آپ مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط کا ترجمہ شائع کر کے بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ میں اس ترجمے سے استفادہ کر رہا ہوں۔ آپ کے اس کام سے اردو

ادب کو فائدہ پہنچے گا۔ اس کام کی خاصی تعریف کر کے اُنھوں نے لکھا کہ آپ نے عبداللہ انصاری پر حاشیہ لکھا ہے اور آپ نے اُن کے بارے میں جو کچھ کہا ہے میرے علم کے مطابق یہ وہ عبداللہ انصاری نہیں ہیں، انھیں سمجھنے میں آپ سے سہو ہوا ہے وہ دوسرے ہیں اور اس کے بعد اُنھوں نے بہت ہی نرم اور مہذب الفاظ میں عبداللہ انصاری کے بارے میں تفصیلات بیان کیں۔ یہ اُن کی علمی عظمت تھی۔ اگر اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس موقعے کا استعمال اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لیے کرتا۔

عرشی صاحب کو شاید غصہ نہیں آتا تھا۔ مجھے بارہا اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا لیکن میں نے اُنھیں کبھی غصہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مگر تھے تو پٹھان۔ ایک آدھ دفعہ اُن کے اندر کا پٹھان باہر بھی آجاتا تھا۔ ایک دفعہ 'آج کل' کے اڈیٹر نے اُنھیں خط لکھ کر ایک مقالے کی فرمائش کی۔ اُن دنوں عرشی صاحب بہت مصروف تھے، اس لیے اُنھوں نے معذرت کر لی۔ اڈیٹر صاحب کی جو شامت آئی تو انھوں نے لکھا کہ ادارہ اُن کے مقالے کا معاوضہ دو سو روپے دے گا۔ بس عرشی صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ اُنھوں نے غصّے میں ایک خط لکھا جو 'آج کل' کے اڈیٹر نے مجھے دکھایا تھا۔ عرشی صاحب نے کچھ اس طرح لکھا تھا کہ:

> "حضرت! میں فقیر آدمی ہوں، علمی کام روپے کمانے کے لیے نہیں کرتا میرے مقالے کی قیمت آپ نے دو سو روپے لکھی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ادارہ 'آج کل' تو کیا، حکومت ہند بھی اگر چاہے تو میرے خونِ جگر کی قیمت نہیں ادا کر سکتی"۔

میں نے بہت کوشش کی کہ اڈیٹر صاحب اس خط کی نقل مجھے دے دیں۔ مگر انھوں نے مناسب نہیں سمجھا۔

ایک دفعہ عرشی صاحب دہلی آئے ہوئے تھے۔ میں نے اُنھیں اپنے غریب

خانے پر کھانے کی دعوت دی۔ یہ اُن کی عظمت تھی کہ اُنھوں نے ایک دفعہ بھی انکار نہیں کیا اور فوراً راضی ہو گئے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جس زمانے میں، میں کروڑی مل کالج میں لیکچرر تھا تو ایک پروفیسر صاحب کو میں نے کھانے پر بلایا۔ اُنھوں نے بڑی بدتمیزی کے ساتھ انکار کر دیا اور بعد میں اُنھوں نے ایک اور صاحب سے شکایت کی۔ ''اب بتایئے کہ لیکچرروں کی بھی یہ ہمت ہوگئی کہ وہ پروفیسروں کو اپنے گھر پر کھانے کے لیے بلاتے ہیں''۔

عرشی صاحب کا علمی مرتبہ وہ تھا کہ میں تو کیا وہ پروفیسر صاحب اُن کے پیروں کی خاک بھی نہیں تھے، اس کے باوجود وہ تشریف لائے۔ وہ مجھے اور اسلم پرویز سے جو محبت کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمیں اپنے ہی مرتبہ کا سمجھتے ہیں۔ خیر وہ ہمارے یہاں کھانے پر آئے۔ ہم بس تین آدمی تھے۔ میں، اسلم پرویز اور عرشی صاحب قبلہ۔ ان دنوں نیاز فتحپوری پاکستان جاچکے تھے اور اکبر علی خاں اُن کا رسالہ 'نیاز' شائع کر رہے تھے۔ مجھے خیال تھا کہ یہ رسالہ نقصان میں چل رہا ہے، اس لیے میں نے عرشی صاحب سے کہا قبلہ! آپ اکبر کو منع کیوں نہیں کرتے۔ 'نگار' کی اشاعت میں تو اُن کی پوری تنخواہ خرچ ہو جاتی ہوگی۔ عرشی صاحب مسکرائے اور کہنے لگے کہ اکبر اس رسالے پر خرچ تو کرتے ہیں مگر میں یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ اگر وہ جوئے یا شراب پر رقم خرچ کرتے تو میں کیا کر لیتا۔ یہ تو علمی کام ہے۔ اُنھوں نے یہ بات کچھ اس طرح کہی کہ میری کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ایک دفعہ پٹھانوں پر گفتگو ہوئی۔ میں نے پٹھانوں کو جانباز لیکن جاہل کہہ دیا۔ عرشی صاحب کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہنے لگے کہ آپ تو خود پٹھان ہیں اور پھر پٹھانوں کو جاہل کہتے ہیں۔ میں کسی کو مشورہ نہیں دیتا لیکن چوں کہ آپ کی رگوں میں وہی خون ہے جو میری رگوں میں ہے اس لیے

آپ سے کہوں گا کہ پٹھانوں کی تاریخ پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پٹھانوں نے علمی میدان میں کیسے عظیم کارنامے انجام دیے ہیں۔اس کے بعد اُنھوں نے ان علما کے علمی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا جو پٹھان تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ عرشی صاحب کو میری بات ناگوار گزری ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب میرے بس میں کچھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ عرشی صاحب جو کچھ کہتے رہیں میں اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا رہوں۔ جب عرشی صاحب اپنی بات کہہ چکے تو میں نے عرض کیا۔ میں نے یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ عرشی صاحب نے کہا کہ پٹھانوں کے بارے میں یہ بات مذاق سے بھی نہیں کہنی چاہیے ورنہ اس سے دوسرے لوگوں کو ہمیں برا بھلا کہنے کا موقع ملتا ہے۔

عرشی صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز ایک جرمن کمپنی کی ایجنسی لے کر شروع کیا تھا۔ چوں کہ یہ کام اُن کے مزاج کے مطابق نہیں تھا، اس لیے کامیاب نہیں ہو سکے۔ کچھ عرصہ ندوۃ العلماء سے منسلک رہے۔ یہاں بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں وہ رضا لائبریری (رام پور) کے ناظم مقرر ہوئے۔ اس کا قصہ دل چسپ انداز میں شبیر علی خاں شکیب صاحب نے اپنے مقالے 'عرشی صاحب: کچھ یادیں کچھ باتیں' میں اس طرح نقل کیا ہے۔

> 'عرشی صاحب مطالعے کے لیے اکثر رضا لائبریری (رام پور) جاتے تھے۔ اُنھیں پتہ چلا کہ لائبریری میں ناظم کا عہدہ خالی ہے۔ چوں کہ ملازمت کی ضرورت تھی اس لیے انھوں نے بھی درخواست دے دی۔ انٹرویو ہوا، جس میں ایک منسٹر ابو محمد صاحب موجود تھے۔ وہ بقول عبدالسلام صاحب ذرا سخت مزاج تھے۔ اُنھوں نے شروع ہی میں عرشی صاحب سے کہا رام پور میں کہاں ایسا شخص ہو سکتا ہے جو اس عظیم ذمے داری کو سنبھال

سکے۔ اگر کوئی ایسا ویسا ہوتا تو ہمت ہار جاتا۔ مگر عرشی صاحب نے ابو محمد صاحب کے سوالوں کا جواب بڑے اعتماد اور اطمینان سے دیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ لائبریری میں کیا خرابیاں ہیں اور اُن خرابیوں کی اصلاح کے لیے اُن کے مشورے کیا ہیں۔ ابو محمد صاحب کا رویہ کچھ نرم پڑا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھوں نے ناظم کے عہدے پر عرشی صاحب کا تقرر کر دیا۔ اس زمانے میں امپیریل لائبریری (کلکتے) کے ریٹائرڈ لائبریرین جے۔ اے۔ چیپ مین لائبریرین مقرر ہو کر رام پور آئے اور عرشی صاحب کو اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ عرشی صاحب نے اُن سے بہت کچھ سیکھا اور جو کچھ سیکھا، اُس کا فائدہ لائبریری کو پہنچا۔ چیپ مین اردو نہیں جانتے تھے، اس لیے عرشی صاحب کو اُن سے ہر وقت انگریزی میں بات کرنی پڑتی تھی، جس کی وجہ سے عرشی صاحب کی انگریزی بہت اچھی ہو گئی۔ اس دوران خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں کٹیلاگنگ کا کام ہو رہا تھا۔ جب کوئی ایک جلد تیار ہو جاتی تو وہ چیپ مین کو بغرضِ منظوری بھیج دی جاتی۔ چیپ مین وہ کٹیلاگ عرشی صاحب کے سپرد کر دیتے اور عرشی صاحب اس کٹیلاگ کا بغور مطالعہ کر کے اس میں جو غلطیاں ہوتیں، اُن کی نشان دہی کر دیتے۔ اس کام سے عرشی صاحب کو بہت فائدہ پہنچا۔ انھوں نے خدا بخش لائبریری کی جو فہرست سازی کی وہ اسی وجہ سے بین الاقوامی معیار پر ہے۔

عرشی صاحب نے لائبریری میں اتنی محنت اور لگن سے کام کیا کہ بعد میں وہ لائبریرین اور پھر ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہ لائبریری اپنی کتابوں اور دوسرے مواد کے اعتبار سے بہت اہم تھی لیکن اس کو جس سلیقے سے مرتب کیا گیا تھا، اُس کی وجہ سے یہ لائبریری ایشیا کی اہم ترین مشرقی لائبریریوں میں شمار ہونے لگی۔

عرشی صاحب سے میری آخری ملاقات ۱۹۸۰ء میں ہوئی تھی وہ سخت بیمار تھے اور میڈیکل چیک اپ کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔ اُن کا قیام کلبِ علی خاں صاحب کے یہاں تھا۔ میں اُن سے جب ملنے گیا تو کافی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ عرشی صاحب کی آواز میں بہت نقاہت آچکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت کوشش کر کے بول رہے ہیں۔ ان دنوں عرشی صاحب کا 'دیوان غالب، نسخۂ عرشی' کا دوسرا اڈیشن زیرِ طبع تھا۔ عرشی صاحب نے کہا کہ میں 'دیوان غالب' کی طباعت کے سلسلے میں آپ کو کئی خط لکھ چکا ہوں مگر شاید مصروفیات کی وجہ سے آپ جواب نہیں دے سکے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کا جب بھی کوئی خط آیا ہے میں نے فوراً جواب دیا ہے لیکن آپ کے خطوط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میرے خطوط آپ تک نہیں پہنچتے۔ غالباً آپ کے دفتر میں کوئی صاحب ایسے ہیں جو آپ کی ڈاک روک لیتے ہیں۔ عرشی صاحب ایک دم خاموش ہو گئے اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اُنھیں بھی اس کا علم تھا کہ اُن کی ڈاک روکی جاتی ہے۔ کہنے لگے کہ بھائی! میری بیماری کی وجہ سے کچھ لوگ ناجائز فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔ آپ اتنا کیجیے کہ وہ نسخہ چھاپ دیجیے۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس کی طباعت میں تاخیر ہوئی۔ مگر بہر حال وہ چھپ گیا۔

عرشی صاحب کا سینہ جس طرح علم کا دفینہ تھا اسی طرح انھوں نے رضا لائبریری رام پور کو بھی علم کا خزینہ بنا دیا۔ مراد یہ ہے کہ کوئی کتب خانہ محض اس بنا پر علم کا خزینہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس میں انتہائی نادر اور نایاب ذخیرۂ کتب اور مخطوطات ہیں۔ ہم نے خراب

ہاتھوں میں پڑ جانے کے سبب علم کے ایسے کئی خزینوں کو عراق کے نادر میوزموں کی طرح لٹتے اور خراب ہوتے دیکھا ہے۔ یہ اہل علم و دانش کی خوش نصیبی ہے کہ رضا لائبریری جیسے علمی خزینے کا بندوبست عرشی صاحب کے ہاتھ میں آیا جو صاحب علم ہی نہیں علم کے قدردان بھی تھے اور اپنے انتہائی مشرقی انداز کے طرز معاشرت کے باوجود اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی اور انتظامی امور کی دیکھ بھال کے معاملے میں انتہائی لائق اور efficient انسان تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ اپنے ذاتی علمی کاموں میں انتہائی مستغرق رہتے تھے وہ لائبریری سے استفادہ کرنے والے ہر سطح کے اسکالر کے لیے وقت نکالنا جانتے تھے۔ کتب خانے کی نایاب سے نایاب اور قدیم سے قدیم کتاب اسکالر کی میز پر چند منٹ میں حاضر کردی جاتی۔ لائبریری کے کٹیلاگ اور شیلفوں پر رکھی ہوئی کتابوں کے درمیان ایک اور ایک کی ہم آہنگی (One to One Correspondence) تھی۔ آپ آنکھ بند کر کے کسی بھی کارڈ پر انگلی رکھ دیجیے۔ وہ کتاب شرطیہ آپ کے سامنے حاضر کردی جائے گی۔ اس ہنرمندی میں عرشی صاحب کی علمیت، علمی رویّہ اور ان کی علمی دیانت داری یہ تینوں چیزیں شامل تھیں اور اسی سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی زندگی کی عبارت ہے۔ اتنے بڑے علمی کاروبارِ زندگی کے باوجود اخلاقی سطح پر نہ وہ بڑے لوگوں کی طرح مردم بیزار تھے اور نہ مذہبی احکام کی ادائیگی کی طرف سے غافل۔ تو کیا انسانِ کامل کی اس کے علاوہ کوئی اور تفسیر ہو سکتی ہے؟ میرے خیال میں شاید نہیں!

غالب، دارالسرور اور چشمۂ آبِ حیات کی ایک سوت

(غالب اور رام پور)

•

آدمی کی طرح شہر کا بھی ایک چہرہ ہوتا ہے۔ کسی نئے شہر کو دیکھ کر اکثر و بیشتر ردِعمل کی ویسی ہی صورتیں پیدا ہوتی ہیں جیسی کہ کسی نئے آدمی سے مل کر۔ یہ تجربہ کبھی خوش گوار ہوتا ہے، کبھی بیزار کرنے والا۔ غالب اپنی زندگی میں کئی شہروں سے متعارف ہوئے۔ آگرہ میں اُن کی ولادت ہوئی اور زندگی کا بیشتر حصہ دلّی میں بسر ہوا۔ آگرہ اور دلّی کے علاوہ انہیں جن شہروں میں کچھ وقت گزارنے کا موقعہ ملا، اُن میں سب سے اہم اور قابلِ ذکر کلکتہ، بنارس اور رام پور ہیں۔ غالب کے لیے کلکتے کو دیکھنا اور وہاں قیام کرنا ایک نئی تہذیب، معاشرت اور شعور کے ایک نئے دائرے میں قدم رکھنا تھا۔ انیسویں صدی کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے واسطے سے شہر کلکتہ کی حیثیت مغرب کی طرف کھلنے والے پہلے دریچے کی تھی۔ اسی دریچے سے غالب نے انگلستان کے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں نمو پذیر ہونے والی ایک نئی معاشرتی زندگی کا نظارہ کیا۔ غالب کے ذہنی سوانح میں کلکتے کا سفر اسی لیے ایک یادگار واقعہ

بن گیا۔ بنارس سے گزرنا اور اُس شہرِ خوبی میں کچھ روز ٹھہرنا بھی غالب کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ غالب کے ''سومناتِ خیال'' کی تشکیل ان کے اسی تجربے کا عطیہ ہے، بنارس پہنچنے سے پہلے، غالب لکھنؤ، باندہ، الہ آباد سے بھی گزرے تھے۔ الہ آباد انہیں پسند نہیں آیا (نگاہ خیرہ ہنگامۂ الہ آباد) معلوم نہیں کون سی مشکل وہاں آن پڑی تھی، اور لکھنؤ میں بھی اُن کا جی نہیں لگا۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا، سودہ کم ہے ہم کو
طاقتِ رنجِ سفر ہی نہیں پاتے اتنا
ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو

تاہم

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طرفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

یعنی کہ ایک طرف تو ناطاقتی کا احساس ہے، دوسری طرف ''سیرِ نجف اور طرفِ حرم کا عزم مگر، پھر بھی لکھنؤ میں زیادہ ٹھہرنے کی طلب نہیں۔ البتہ لکھنؤ سے آگے، بنارس کا قیام غالب کے احساسات پر ایک تجربے کی صورت وارد ہوا۔ اس تجربے نے غالب کے شعور میں ایک طرح کا تخلیقی ارتعاش بھی پیدا کیا جس نے انجام کار مثنوی 'چراغ دیر' کی شکل اختیار کی۔
بنارس کے آگے غالب جہان آباد تک کو بھلا بیٹھے:

جہاں آباد گر نہ بُود الم نیست
جہاں آباد بادا جائے کم نیست

نباشد قحط بہرِ آشیانے
سرِ شاخِ گُل، در گلستانے

بخاطر دارم ایک گل زمینے
بہار آئیں، سوادِ دل نشینے
کہ می آید بہ دعوی گاہ لافش
جہان آباد از بہرِ طوافش
تعالیٰ اللہ بنارس چشمِ بد دور
بہشتِ خرم و فردوسِ معمور!

بنارس کا خیال غالب کے دل میں ایسا بیٹھا تھا کہ چالیس برس بعد بھی ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ ''اگر میں جوانی میں وہاں جاتا تو وہیں بس جاتا''۔ آگرہ، دہلی کلکتہ، لکھنؤ، الہ آباد، بنارس کے علاوہ چھوٹے بڑے کچھ اور شہر بھی غالب کے تجربے میں آئے۔ مثلاً کان پور، باندہ اور میرٹھ۔ مگر اُن کے حواس پر ان میں سے کسی کا نقش پایدار نہ ہوسکا۔ اس پس منظر میں رام پور سے غالب کی نسبت پر غور کیا جائے تو ایک الگ تصویر ابھرتی ہے۔ بہ ظاہر یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا مگر ایک ریاست کی راجدھانی ہونے کے باعث اسے ایک خاص سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ فراغت کے ماحول اور شاہی سرپرستی کی وجہ سے اس شہر میں علم دوستی کی ایک مستحکم روایت قائم ہوئی جس کا اثر گردوپیش کی زندگی پر بھی پڑا۔ رفتہ رفتہ رام پور شاعروں، عالموں، طبیبوں، ہنر مندوں کا ایک معروف مرکز بن گیا۔ غالب سے اس شہر کے رابطوں کا جائزہ ایک ساتھ کئی سطحوں پر لیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب کے اس تعلق کی پہلی سطح معاشی تھی۔ نواب محمد یوسف علی خاں ناظم کی سرپرستی نے ان کی مالی مشکلات کسی حد تک کم کردی تھیں۔ دربار سے ان کا وظیفہ مقرر ہوگیا تھا لیکن

اس سے زیادہ اہم واقعہ غالب کے اپنے الفاظ میں یہ تھا کہ

نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے... سو روپے مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے مہینا بہ نام دعوت اور دیا یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپیہ مہینا پاؤں اور دلّی میں رہوں تو سو روپئے بھائی سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں، مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم، جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔

(خط بنام میر مہدی مجروحؔ، جمعہ، ۶/اپریل ۱۸۶۰) بحوالہ غالب کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، جلد دوم، ص ۵۱۸۔

گویا کہ رام پور سے وابستگی نے غالب کو معاشی سہارے کے ساتھ ساتھ ایک جذباتی سہارا بھی دیا۔ غالب کی زندگی کے بعض واقعات (مثلاً دلّی کالج میں نوکری کے لیے اُن کا جانا اور بے فیض لوٹ آنا، قلعۂ معلّی سے ان کے سلسلۂ ملازمت، پنشن کے قضیے اور کلکتے کے سفر) پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دربار رام پور سے پہلے، غالب کو معاشی فراغت کی جستجو میں جن صبر آزما اور مشکل حالات سے گزرنا پڑا، انہوں نے غالب کی پوری شخصیت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ زمانے کی نظر سے زیادہ ملال انہیں آپ اپنی نظر میں سبک ہونے کا تھا:

بوڑھا ہوگیا ہوں، بہرا ہوگیا ہوں۔ سرکارِ انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا، اب بدنام ہوگیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبّا لگ گیا ہے۔ کسی

ریاست میں دخل کہ نہیں کر سکتا تھا مگر ہاں، استاد یا پیر یا مدّاح
بن کر راہ و رسم پیدا کروں۔

(خط بنام ہر گوپال تفتہ، جمعہ دہم دسمبر ۱۸۵۲ء) حوالہ خلیق
انجم، جلد اوّل، ص ۲۴۶

یہ تمہارا دعا گو اگر چہ اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج
میں اس کا پایہ بہت عالی ہے، یعنی بہت محتاج ہوں۔

(بنام تفتہ، نہم جون ۱۸۵۳ء) حوالہ ایضاً ص ۲۵۸

یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ اس
طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزہ کھا کھا کر کاٹا،
آئندہ خدا رزاق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس
صاحب، جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگر چہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم
ہے؟

(بنام میر مہدی مجروح ۱۰ اپریل ۱۸۵۷ء) حوالہ ایضاً، جلد
دوم، ص ۴۹۳، ۹۴

یہ زندگی سے تھکے ہوئے، ایک ہارے ہوئے انتہائی حسّاس شخص کی آواز ہے، ایک مجروح انا کی سرگوشی، ایک تن بہ تقدیر، راضی بہ رضا پر شکستہ اور زخمی روح کے احساسات۔ غالب اپنے کمال سخن اور اپنی متاعِ ہنر کا گیان رکھتے ہوئے بھی، مادّی مشکلات کے بوجھ اور روز مرّہ زندگی کے معاملات سے سمجھوتے کرتے رہنے کے باعث، ایسا لگتا ہے کہ اب اپنی طرف سے کلیتاً مایوس ہو چکے تھے۔ ایسی صورت میں نواب یوسف علی خاں ناظم کی طرف سے ان کی جو بھی پذیرائی ہوئی، اُسے غالب کے لیے ایک بہت بڑی اخلاقی، نفسیاتی اور ذہنی امداد سمجھنا چاہیے۔ اپنے بچپن میں انہوں نے دہلی میں غالب سے کچھ فارسی پڑھی تھی،

لیکن ۱۸۵۷ء میں ان کا غالب کی شاگردی اختیار کرنا اور اس تعلق کا اظہار ارادت و انکسار کے پیرائے میں کرنا غالب کے لیے بے مہریٔ ایام کی عام اور متوقع روش کے برعکس، اپنے باطن کی بحالی کا ایک موثر ذریعہ تھا:

میرے مشفق! مجھے آج تک کبھی ایک مصرعہ تک موزوں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن محض مولوی فضل حق موصوف کی زبانی، آپ کا بلند پایہ کلام سننے سے دل چاہا کہ کسی طرح آپ سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری ہو جائے۔ چونکہ اس کے لیے اس سے بہتر کوئی سبیل میری سمجھ میں نہیں آئی، اس لیے میں نے چند شعر غلط سلط موزوں کیے ہیں، امیدوار ہوں کہ ان غزلوں کو اصلاح اور جدید مصرعِ طرح تجویز کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

(مکاتیب غالب، مرتبہ عرشی، حواشی، بحوالہ مالک رام، فسانۂ عجائب، ص ۱۴۵)

رام پور سے یہ رشتہ جس سطح پر قائم ہوا تھا اس سے غالب کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ خطوں میں غالب ان پر سے اپنے تعلق کا اور جس بے تکلفی اور کھلے پن کے ساتھ اپنی حالت زار اور احتیاج کا بیان کرنے لگے، اسکا اندازہ کچھ ان اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

خداوندِ نعمت! سلامت

جو آپ بن مانگے دیں، اُس کے لینے میں مجھے انکار نہیں اور جب مجھ کو حاجت آ پڑے تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔

بارِ گرانِ غم سے پست ہو گیا ہوں۔ آگے تنگ دست تھا، اب تہی دست ہو گیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجے اور کچھ بھجوا دیجے۔

(خط بنام یوسف علی خاں ناظم، ۱۷ ر نومبر ۱۸۵۸ء، بحوالہ خلیق

انجم، جلد سوم، ص ۱۱۸۲

میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا۔ پینشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے، اُس کو ملتوی چھوڑ کر کیوں کر چلا آؤں۔

(خط بنام ناظم، بحوالہ ایضاً، ۱۱۸۲) ۳ دسمبر ۱۸۵۸ء

نواب مرزا نے دلّی آکر پہلے نویدِ بزم آرائی سنائی۔ چاہتا تھا کہ اس کی تہنیت لکھوں۔ کل اس نے اردوئے خطِ آمدِ رام پور حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ کیا کہوں، کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصوّر کر کر اور زیادہ مغموم ہوا۔

(خط بنام ناظم، ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء، بحوالہ ایضاً ص ۱۱۸۳)

آداب نیاز بجالا کر عرض کرتا ہوں کہ سو روپے کی ہنڈوی بابت مصارفِ ماہِ نومبر ۱۸۵۸ء پہنچی اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہو گیا اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں، اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجھ کو اور بھیج دیجیے گا تو چلا لیجے گا، لیکن اس شرط سے کہ اس میں عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔

(خط بنام ناظم، ہشتم دسمبر ۱۸۵۹ء، بحوالہ ایضاً ص ۱۱۸۸)

ناظم کے نام غالب کے خطوط بالعموم غیر دل چسپ۔ دو ٹوک اور کاروباری انداز کے ہیں۔ زیادہ تر خطوں میں یا تو اپنی مجبوریوں کا تذکرہ ہے یا امداد کا تقاضہ یا پھر وظیفے کی وصولیابی کی رسید۔ لیکن ان خطوں کا موازنہ اگر نواب کلب علی خاں کے نام لکھے جانے والے خطوں سے

کیا جائے تو ایک دوسری صورت حال سامنے آتی ہے۔ ان میں غالب عبارت آرائی بھی کرتے ہیں۔ کچھ مضمون بھی باندھتے ہیں اور کبھی شعری اسرار و رموز پر باتیں بھی کرتے ہیں۔ نواب کلب علی خاں غالب کے باقاعدہ شاگرد تو نہیں تھے مگر احتراماً ایک بار جو یہ لکھ دیا کہ ''مرا ازاں مشفق (غالب) واسطۂ تلمّذ بودہ است'، تو غالب پھولے نہیں سمائے اور اسی جوش میں جواباً بے ضرورت اپنی فارسی دانی کا مظاہرہ بھی کر بیٹھے:

''مرا ازان مشفق واسطۂ تلمّذ بودہاست''۔ یہ ذلیل کو عزت دینی اور دکانِ بے رونق کی خریداری کرنی ہے، میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔

بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے، بارے مراد بر آئی اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اُس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے مگر دعویِ اجتہاد نہیں ہے، بحث کا طریق یاد نہیں۔

(خط بنام کلبِ علی خاں۔ ۱۷/ اکتوبار ۱۸۶۶ء، بحوالہ خلیق انجم، جلد سوم، ص ۱۲۳۴)

اس جسارتِ بے جا کے نتیجے میں غالب کو جس آزمائش سے گزرنا پڑا اور معافی تلافی کرنی پڑی اس کا قصہ الگ ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کلب علی خاں کے نام غالب کے جو خط دستیاب ہوئے ہیں ان میں نثر کا وہی سحر طراز اسلوب ملتا ہے جس سے غالب پہچانے جاتے ہیں۔

حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا۔ وہ آگ

برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے، پانی برسے گا۔ سفر، خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورتوں میں متعذّر، آفتاب میزان میں آیا اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا اور میں نے احرامِ بیت المعمورِ رام پور باندھا۔

(خط بنام کلب علی خاں، ۱۸ر جون ۱۸۶۵ء، بحوالہ خلیق انجم، جلد سوم، ص ۱۲۰۸)

بندہ ہنڈوی کی رسید بھجوا چکا ہے۔ یہاں خلق کو مینھ درکار ہے اور ہوا شرارہ بار ہے۔ دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تیور اور پہاڑ کے پتھر جلے جاتے ہیں۔ پانی جگر گداز، ہوا جانستاں، امراضِ مختلفہ کا ہجوم جہاں تہاں۔ جُز اعضائے انساں کے کہ وہ پسینے میں تر ہیں، طراوت و رطوبت کا کہیں پتہ نہیں۔ یا لُو چلتی ہے یا مطلق ہوا نہیں۔ اگرچہ یہاں مینھ اِس قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیں دار حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ یہ فرمانِ ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابرِ رحمت کے شکریے میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں، بہ نظرِ اصلاحِ نظم و اصلاحِ حال ملاحظہ ہو:

قطعہ

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے زور سے، ابرِ ستارہ بار، برس
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟

بیار، لائے گلنار گوں، بہار، برس

خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پر، اے ابر! بار بار برس

ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو مَلِک وہ کہے
امیرِ کلب علی خاں جئیں ہزار برس

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس

جنابِ قبلۂ حاجات اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

میں طبیب نہیں، مگر تجربہ کار ہوں۔ ستّر برس کا آدمی ہوشیار ہوں۔ اور سے یہ کہا نہیں جاتا۔ حضرت پر بغیر ظاہر کیے رہا نہیں جاتا۔ خدا جانے اور طبیب کیا سمجھے ہوں گے کہ کیا تھا۔ میرے نزدیک بہ اشتراکِ معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا۔ اب آپ کو حفظِ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیلِ دریائی و جدوار کا استعمال ضرور ہے اور معجونِ طلائی عنبری تقویتِ قلب میں مجوزۂ حکیم بر علی خاں مغفور ہے۔ ورق طلا، عنبر اشہب، عرقِ کیوڑہ، قند کثرت اجزا اس ترکیبِ خاص میں ناپسند۔ وغیرہ وغیرہ

(بحوالہ ایضاً، خلیق انجم، جلد سوم، ص ۱۲۱۸)

دلّی سے رام پور تک ذوقِ قدم بوس میں جوانا نہ گیا۔ اختلافاتِ

آب و ہوا و تفرقۂ اوقاتِ غذا کو ہرگز نہ مانا اور رنجِ راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا وقت معاودت اندوہِ فراق نے وہ فشار دیا کہ جوہرِ روح گداز پا کہ ہر بُن مُو سے ٹپک گیا۔

(بحوالہ ایضاً، ص۱۲۲۲)

آپ اس درویش دل ریش کا حال سنیے سامعہ مدت سے کھو بیٹھا۔ اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا۔ دور سے صرف قد و قامت آدمی کا دیکھا جاتا ہے۔ چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آتا ہے۔

(بحوالہ ایضاً، ۱۲۲۳)

نمایش گاہِ سراسر سور رام پور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خون جگر کھاتا ہوں کہ ہائے میں وہاں نہیں، بالا خانے پر رہتا ہوں، اتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گوڈ میں لے کر اتارا اور پالکی میں بٹھا دیا۔ کہار چلے، راہ میں نہ مرا اور رام پور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر بے نظیر میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس اور میں طائرِ اسیر۔ وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بہ طریقِ فرضِ محال ہے۔ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔

(بحوالہ ایضاً، ص۱۲۴۵)

ایک قطعہ پندرہ شعر کا بھیجتا ہوں۔ حضور ملاحظہ فرمائیں۔

مضامین کی طرز نئی، مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا:

رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم

رام پور، آج ہے وہ بقعۂ معمور کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
رام پور ایک بڑا باغ ہے از روے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خورم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اُسی طور پہ یہاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام
درِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبح دم باغ میں آجائے جسے ہو نہ یقین
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبّذا باغِ ہمایونِ تقدّس آثار
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس
خضر بھی یاں اگر آجائے، تو لے ان کے قدم
(بحوالہ ایضاً، ص ۱۴۰۱/۱۴۰۰)

ان مثالوں کے ذریعے غالب کی نثر اور ان کے سوانح کے ایک باب، ریاست رام پور سے ان کے تعلق اور اس شہر کی بابت ان کی رائے، دونوں کے مضمرات پر روشنی پڑتی ہے۔ غالب نے اپنے مکاتیب کے توسط سے اردو میں نثر کا جو معیار قائم کیا وہ ہر لحاظ سے غیر معمولی ہے اور اردو نثر کے معماروں کی پہلی صف میں ان کی جگہ محفوظ کر دیتا ہے۔ ایسی جادو بھری نثر جو زندگی، تجربے، شخصیت، زبان اور اسلوب کو یکجان کر دے غالب سے پہلے صرف میر امن کے یہاں اس کے کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں اور اپنے بعد کے نثر نگاروں میں بھی غالب

ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نثر زمین سے لگ کر چلتی ہے، تاہم ایک ہمہ گیر تخلیقی شخصیت اور شعور کی ترجمان بھی نظر آتی ہے۔ اس میں حقیقت اور افسانے کے عناصر باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ علاوہ ازیں، شہر رام پور کے سلسلے میں غالب کا رویہ، ایک آگرہ، کلکتہ، دلی او ربنارس کو چھوڑ کر، ہماری خاص توجہ کا تقاضہ کیوں کرتا ہے، ان خطوں سے اس امر کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، رام پور غالب کے لیے ایک شہر یا بستی نہیں ایک تجربہ بھی ہے جوان کے احساسات پر وارد ہوا۔ رامپور کے تذکرے میں غالب کے یہاں ایک وارفتگی، نشے کی سی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ نواب کلب علی خاں کو بھیجے جانے والے اس قطعے کے اشعار میں بھی تخلیقیت کے کچھ ایسے رنگ شامل ہو گئے ہیں جن سے غالب کی شاعری پہچانی جاتی ہے۔ نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ایک خط (مرقومہ ۶ ردسمبر ۱۸۶۵ء) میں انہوں نے شہر رام پور کے ایک جشن اور والی شہر، دونوں کا نقشہ کھینچا ہے جس سے کلب علی خاں کے لیے غالب کی تحسین اور پسندیدگی کے پس منظر کا کچھ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا شہر سے دو کوس پر آغاز پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس ن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رام پور کے مہمان، کل سہ شنبہ، پانچ دسمبر حضورِ پُر نور بڑے تجمل سے آغاز پور تشریف لے گئے۔
>
> بارہ پر دو بج گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو

کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار ہوا ہوگا.... رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد، رنگ، شکل، شمائل بعینہ بھائی ضیاء الدین خاں، عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت۔ حلیم و خلیق، باذل کریم متواضع، متشرّع، متورّع، شعرفہم، سینکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خواب لکھتے ہیں۔ جلالاے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ اُن کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریرسن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ الٰہم اقبالہٗ وزادِ جلالہٗ۔۔ وغیرہ وغیرہ

(بحوالہ خلیق انجم، جلد اوّل، ص ۲۰)

گویا کہ رام پور کی شان و شوکت کے ساتھ ساتھ غالب رام پور کے فرماں روا کی علمی فضیلت اور جاہ و حشم کا رعب بھی طاری تھا۔ اس خط کے مخاطب خود نواب کلب علی خاں نہیں ہیں بلکہ غالب کے ایک عزیز شاگرد ہیں اس لیے منقولہ اقتباس کو غالب کے حقیقی جذبات کا ترجمان سمجھنا چاہیے۔ رہی رام پور کے لیے غالب کی چاہت تو اس کا سلسلہ ریاست اور فرماں روائے ریاست سے غالب کے کاروباری اور اقتصادی رابطوں سے آگے بھی جاتا ہے۔ میر مہدی مجروحؔ کے نام ایک خط میں (مورخہ فروری ۱۸۶۰ء) غالب نے اس شہرِ خوبی کے ایک اور امتیاز کی نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں اور کس والہانہ پیرائے میں لکھتے ہیں کہ:

اہاہاہا! میرا پیارا میر مہدی آیا۔ آؤ بھائی، مزاج تو اچھا ہے؟ بیٹھو، یہ رام پور ہے۔ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے؟ پانی، سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اُس کا نام ہے۔ بے شبہہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس

میں ملی ہے۔ خیر، اگر یوں بھی ہے تو بھائی، آبِ حیات عمر
بڑھاتا ہے، لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔
(بحوالہ خلیق انجم، جلد دوم، ص ۵۱۷)

گویا کہ پانی جو زندگی کی بنیادی علامت ہے، رام پور سے غالب کے تعلق کا ایک اور زاویہ سامنے لاتا ہے۔ غالب نے اپنے بعض خطوں میں کنووں کا اور پانی کے ذائقے کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کو جتنی دلچسپی تصورات اور ذہنی تجربوں سے تھی، اتنی ہی دل چسپی اشیا، اشخاص اور مظاہر سے بھی تھی۔ چنانچہ رام پور سے غالب کے تعلق کی نوعیت کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اس نکتے کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تعلق انسانی عناصر اور اوصاف کی ایک رنگارنگ اور زندگی سے معمور سطح پر استوار ہوا تھا۔ غالب کے خطوں میں زندگی اور موجودات سے ان کے براہ راست، کھرے اور سچے رشتوں کی تصدیق انہی واسطوں سے ہوتی ہے۔ زندگی کی عظمت اور حقیقت تک رسائی زندگی کے عام تجربوں، معمولات اور چاروں طرف بکھری ہوئی بہ ظاہر غیر اہم اور مانوس اشیا سے تعلق کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے غالب کے یہاں ان حوالوں کی موجودگی دراصل زندگی اور کائنات کی طرف ان کے مجموعی رویّے کا پتہ دیتی ہے۔

اور رام پور سے غالب کے روابط اور رشتوں کی اس روداد میں غالب شناسی کی اس غیر معمولی روایت کے رنگ بھی شامل ہیں جن سے ہمارا تعارف غالبیات کے ایک عدیم المثال، ممتاز محقق اور عالم کے توسط سے ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی برگزیدہ روح موت کی دیوار کے اُس پار سے اس تقریب کا منظر دیکھ رہی ہوگی اور خوش ہوگی کہ ان کے شہر سے غالب کا تعلق اُن کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ زندگی میں کچھ باتیں باقی رہ جائیں تو زندگی بھی بامعنی دکھائی دیتی ہے۔

نثار احمد فاروقی

مرزا غالب اور دربار رام پور

سابق ریاست رام پور کے دو فرماں رواؤں سے مرزا غالب کا تعلق رہا۔ نواب محمد سعید خان بن نواب غلام محمد خان (وفات ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء) کے فرزند اکبر نواب یوسف علی خان نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کچھ مدت تک دہلی میں رہ کر مفتی صدرالدین خان آزردہ، مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا غالب سے تعلیم حاصل کی تھی، مرزا غالب سے اُن کا تعارف اُسی زمانے میں ہو چکا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نواب محمد سعید خان کے چھوٹے بھائی نواب عبداللہ خان نے ۱۸۴۹ء میں غالب سے فرمایش کی تھی کہ وہ نواب محمد سعید خاں کی مدح میں قصیدہ لکھیں تو غالب نے جواب میں معذرت کا خط لکھ دیا تھا (۱۱/ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ/۲۸/اکتوبر ۱۸۴۹ء) (کلیات نثر غالب ۲۱۹) مگر جب اپریل ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خان مسند نشین ہوئے تو غالب نے قطعۂ تاریخ جلوس لکھ کر بھیجا، وہاں سے اُس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ نواب یوسف علی خان سے غالب کے تعلقات کی تجدید مولانا فضل حق

خیر آبادی نے کرائی تھی۔ غالب نے ۲۸؍جنوری ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں نواب صاحب کو لکھا تھا کہ حافظ محمد فضل حق خان بہادر نے یہ فرمان بھیجا کہ "سرکار کی خدمت کے لیے کمربستہ ہوجائے" (مکاتیب ۴۷)۔ ۵؍فروری ۱۸۵۷ء کو نواب صاحب نے اپنے کچھ اشعار اصلاح کے لیے بھیجے تو غالب کو بھی ولولہ پیدا ہوا اور انہوں نے ۱۱؍فروری کو ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر رام پور بھیجا اور اس کی اطلاع مولانا فضل حق خیر آبادی کو بھی دی جو اُس وقت الور میں تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے سارے ملک میں آگ لگادی تھی اُس وقت نواب یوسف علی خاں نے حکومت برطانیہ کا ساتھ دیا اور روہیل کھنڈ کے علاقے کو کسی حد تک انگریزوں کی انتقامی کارروائی سے بچا بھی لیا۔ اس کے صلے میں ملکہ وکٹوریہ نے انہیں ۱۸۵۹ء میں "فرزند دلپذیر دولتِ انگلیسیہ" کا خطاب دیا۔ ۱۸۶۰ء میں ایک لاکھ ۲۸ ہزار پانسو ستائیس روپیہ سالانہ آمدنی کی زمین دی گئی۔ ۱۸۶۲ء میں انہیں باقاعدہ سند ریاست ملی۔ ۷؍نومبر ۱۸۶۴ء کو اس مذکورہ آمدنی کے بدلے میں کچھ دیہات کا ریاست میں اضافہ کردیا گیا۔

نواب یوسف علی خان اچھا ادبی مذاق رکھتے تھے ناظم تخلص غالب ہی نے تجویز کیا تھا وہ شاعروں کے قدردان بھی تھے۔ جب انہوں نے منیر شکوہ آبادی کا یہ مقطع سنا:

میرے ہنر کا کوئی نہیں قدرداں منیر
شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

تو اپنی غزل کے مقطع میں منیر کو خطاب کر کے کہا تھا:

ناظم، منیر آئے یہاں، ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

غالب ایک خط میں نواب کلب علی خان کو لکھتے ہیں کہ "میں نواب فردس مکان کی خدمت میں مدحیہ قصیدہ بھیجتا تو وہ ۲۵۰ روپے کی ہنڈوی بھیجا کرتے تھے۔" (مکاتیب

غالب: ۱۳۷)

نواب یوسف علی خان سے فیض پانے والوں میں بہت سے علماء، شعرا اور فنکار ہیں ان میں غالب کے علاوہ مفتی صدرالدین آزردہ، مظفر علی اسیر، علی بخش بیمار (شاگرد مصحفی)، مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولانا فضل حق خیرآبادی وغیرہ بہت سے نام آتے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں نواب یوسف علی خان فن شعر میں باقاعدہ غالب کے شاگرد بھی ہو گئے تھے اس کے لیے جولائی ۱۸۵۹ء سے ان کا سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔ نواب یوسف علی خان ناظم کی مدح میں غالب کے چار قصیدے ہیں جن کے مطلع اس طرح ہیں:

۱۔

ہمانا اگر گوہر جان فرستم
بہ نواب یوسف علی خان فرستم

۴۱ر اشعار کا یہ قصیدہ ۱۱ر فروری ۱۸۵۷ء کو کہا گیا تھا۔ پورا قصیدہ مکاتیب غالب (ص ۳) میں نقل ہوا ہے اور اس کتاب کا جو مطبوعہ نسخہ کتب خانۂ رضا میں محفوظ ہے اُس کے حاشیے پر اکبر علی خان عرشی زادہ مرحوم نے اپنے قلم سے لکھا ہے: ''اس کی اصل موجود نہیں ہے'' جس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے قصائد کی موجود تھی۔

۲۔

چون ہست مرا شربتِ آبے ز تو حاصل
دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ حاصل

یہ قصیدہ اگست ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا۔ مکاتیب غالب میں سہو کتابت سے پہلا مصرع یوں چھپا ہے:

''چون نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل'' مگر ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے۔ اکبر علی خان مرحوم نے مکاتیب غالب مطبوعہ کے صفحہ ۱۹ پر اپنے قلم سے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ ۳۸۲۶ف میں ہے

مگر بخط غالب نہیں ہے۔

۳۔ تیسرا قصیدہ ۲۷ر نومبر ۱۸۶۴ء کو نواب یوسف علی خان کے غسل صحت کرنے پر لکھا گیا جس کا مطلع ہے:

تعظیم غسل صحت نواب کم مگیر

زان عید کان مضاف بود جانب غدیر

۴۔ چوتھا قیصدہ ۲۵ر دسمبر ۱۸۶۴ء اور جنوری ۱۸۶۵ء کے درمیان کسی وقت تہنیت عید میں کہا گیا:

مرحبا سالِ فرخی آئین

عیدِ شوال و ماہِ فروردین

مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم نے حساب جوڑ کر بتایا ہے کہ ریاست رام پور سے غالب کو مجموعی طور پر پانچ ہزار ایک سو پچھتر روپے بطور صلہ و امداد ملے۔ (مکاتیب غالب ۱۳۴) اس رقم کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ اس وقت پانچ ہزار روپے میں پانچ کلو سونا مل جاتا تھا جو اب پچیس لاکھ روپے میں ملے گا۔

نواب یوسف علی خان کی وفات ۲۱ر اپریل ۱۸۶۵ء/۲۴ر قعیدۃ ۱۲۸۱ھ کے بعد اُن کے جانشین نواب کلب علی خان کو حکومت برطانیہ سے خلعت و خطاب ملا تو دسمبر ۱۸۶۵ء کے پہلے ہفتے میں جشن ہونا تھا جسے غالب نے ''جشن جمشیدی'' کہا ہے اس تقریب میں مرزا غالب نے ایک فارسی نثر لکھی جو کلیات نثر فارسی (ص ۹۱) میں ملتی ہے اس کے آخر میں کہتے ہیں:

آخر بہ فضائے بارگاہ آمدہ است ہنگام فروزشِ نگاہ آمدہ است

چون نور کہ از مہر بہ ماہ آمدہ است تشریف شہنشاہ بہ شاہ آمدہ است

اور ۳۰ر شعروں کا ایک مدحیہ قصیدہ بھی کہا تھا جو ''سبد چین'' میں شامل ہے اور اس کے بارہ

اشعار امیر مینائی نے تذکرۂ انتخاب یادگار (ص ۲۴۹) میں انتخاب کیے ہیں۔ اس مدحیہ قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں:

تا چہ نیرنگ است این کاندر جہان آوردہ اند | نو بہارِ طرفہ در فصل خزان آوردہ اند
در بشت آن خود نباشد بگذراز اردی بہشت | رونقے کز بہر باغ و بوستان آوردہ اند
چون جوہر را شمارے نیست، گویا مجملاً | حاصلِ صد سالۂ دریا و کان آوردہ اند
دولت و اقبال و فخر و عزت و جاہ و جلال | کز فراوانی نگنجد در گمان آوردہ اند
شاہِ داور را نوید دولت و دین دادہ اند | شہریان را مژدۂ امن و امان آوردہ اند

۱۸۶۷ء میں نواب کلب علی خاں کو حکومت برطانیہ کی طرف سے ۱۳ر توپ سلامی کا اعزاز ملا اور ۱۸۷۳ء میں خاندانی خطاب ''فرزند دلپذیر دولت انگلیسہ'' سے بھی سرفراز کیے گئے۔ اُن کا عہد فرماں روائی ۱۸۸۷ء تک رہا۔ مرزا غالب اُن کے عہد ہی میں رام پور آئے تھے اور یہاں ریاست کے مہمان رہے تھے۔ انہیں ریاست کی طرف سے محلّہ راجدوارہ کے ایک بڑے مکان میں ٹھہرایا گیا تھا جس پر ۲۱ر فروری ۱۹۴۴ء کو ایک یادگاری تختی بھی نصب کی گئی تھی اور اُس کی نقاب کشائی نواب سر رضا علی خان مرحوم نے کی تھی۔ میں نے اُس مکان پر وہ تختی ۱۹۵۴ء میں دیکھی تھی۔ اب وہ غائب ہو چکی ہے۔

غالب کے سفر رام پور کی کل مدت تین ماہ ہوتی ہے وہ ۷ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو دہلی سے روانہ ہوئے تھے اور دوشنبہ ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء کو گیارہ بجے دن میں دہلی واپس آگئے تھے۔ سفر میں اُن کے ساتھ باقر علی خان کامل اور حسین علی خان شادان بھی تھے جنہیں اس امید پر لے گئے تھے کہ شاید ریاست میں کوئی خدمت انہیں مل جائے مگر یہ امید پوری نہ ہو سکی، انہوں نے اپنی روانگی سے دو ہفتہ قبل ہی ان دونوں کو دہلی واپس بھیج دیا تھا۔

غالب نے نواب کلب علی خاں کی مدح میں بھی اردو اور فارسی میں اشعار لکھے۔ اُن کی مسند نشینی کے بعد ۶ر مئی ۱۸۶۵ء کو تہنیت عید کے یہ اشعار بھیجے تھے:

سرتاسر دہ رعشرتستان تو باد صد رنگ گلِ طرب بدامانِ تو باد
عید است و بہار خرمی ہا دارد جانِ من و صد چومن بہ قربانِ تو باد

اور ۱۶ر محرم ۱۲۸۱ کو یہ قطعہ تاریخ لکھ بھیجا تھا:

نواب کہ شد ز شکوتِ اقبالش بخشیدنِ باج غلہ از اقبالش (کذا)
فارغ شد ہر کسے درو داد فراغ ہم فارغ و ہم فراغ باشد سالش
(۱۲۸۱ھ)

اس کے بعد جمعہ ۱۱ر اگست ۱۸۶۵ء کو ایک اور قصیدہ بھیجا:

مقام شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک رہا ہے زور سے ابر ستارہ بار برس
کہاں ہے ساقیِ مہوش، کہاں ہے ابر مطیر؟ بیار، لا مئے گلنار گون، ببار، برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی درِ حضور پر اے ابر باربار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے ، امیر کلبِ علی خاں جئیں ہزار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں؟ کئی ہزار بلکہ بے شمار برس
جناب قبلۂ حاجات اس بلاکش نے بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو غالب کو بندِ غم سے نجات خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

دس دن کے بعد ۲۱ر اگست ۱۸۶۵ء کو اکیاون اشعار کا ایک فارسی قصیدہ بھیجا جس میں یہ التزام کیا تھا کہ داستان امیر حمزہ کے کرداروں کے نام اور معاملات درمیان میں آئیں، اُس کے چند شعر یہ ہیں:

زہے دو چشم تو در معرض سیہ کاری چو بختیارک و بلکنگ بہ مردم آزاری
زہے بزور بدیع الزمان کشتی گیر کہ کوہسار چو نارنج تر بیفشاری

آخر میں کہتے ہیں:

رموزِ حمزہ فروہش، خمش نشین غالب چرا مرا بہ سخن ہائے ہرزہ آزاری

ز تست رونقِ گیتی بہ دانش آرائی　　ز تست زینتِ معنی بہ نغز گفتاری

قصیدۂ تو ولے کاسۂ گدائی تست　　ستودہ آمدہ باشی ز رنج ناداری

غمین مباش کہ از گنج خانۂ نواب　　خودآن قدر کہ بہ دل داشتی بدست آری

بہ وقتِ گدیہ، گدارادعاست دست آویز　　برآردست بدرگاہِ حضرتِ باری

چراغِ دودۂ سرور علی محمد خان　　گزین ہمالِ تمر درفنِ سپہ داری

ز روے کلبِ علی خان ہمیشہ روشن باد　　چنانکہ تابشِ مہر از سپہر زنگاری

غالب نے ۲۹/مارچ ۱۸۶۶ء کے اپنے ایک خط میں چند مدحیہ اشعار غزل کی صورت میں بھیجے تھے اور اسی خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نواب مرزا خان داغ کا توسط استعمال کیا تھا:

اے خداوندِ خردمند و جہاں داورِ دانا　　وے بہ نیروے خرد، بر ہمہ کردار توانا

اے برفتار و بدیدار، بہ زیبائی و خوبی　　سروِ نو خاستہ آسا، مہِ نا کاستہ مانا

بہ ادا پایہ فزایا، بہ نظر عقدہ کشایا　　بہ کرم ابر عطایا، بہ غضب برق سنانا

بہ نگہ خستہ نوازا بہ سخن بذلہ طرازا　　بہ قلم غالیہ سایا، بہ نفس عطر فشانا

شہ نشان کلب علی خان کہ توئی یوسفِ ثانی　　نبود ثانی و ہمتاے تو در دہر ہمانا

دانم از حال و مآلم خبرے داشتہ باشی　　سرنوشتِ ازلی گرچہ ندارد خطِ خوانا

دشمنم چرخ و تو بینی ونسوزی بہ عتابش　　بہ عدو صاعقہ ریزا، بہ محب فیض رسانا

جانشین تو کند نام ترا زندہ بہ گیتی　　باد فردوس برین جاے تو فردوس مکانا

غالب از غم چہ خروشی بہ تو زیباست خموشی　　با کریم ہمہ دان ہیچ مگو، ہیچ مدانا!

انہوں نے اپنی ایک مشہور غزل میں بھی ایک مدحیہ قطعہ شامل کر دیا تھا جو متداول دیوان سے خارج کر دیا:

در پر امیر کلب علی خان کے ہوں مقیم　　شایستۂ گدائی ہر در نہیں ہوں میں

بوڑھا ہوا ہوں، قابل خدمت نہیں اسد — خیرات خوار محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں!

۱۴/ اپریل ۱۸۶۷ء کو بے نظیر باغ کے میلے کی تاریخ کہہ کر بھیجی:

نمایش گہِ در خورِ شانِ خویش — بیا راست نواب عالی جناب
ببین چون طرب را نہایت نماند — بود سالِ آن "بخشش بے حساب"
(۱۲۸۴ھ)

پھر دو دن کے بعد ۱۶/ اپریل ۱۸۶۷ء کو یہ مدحیہ قطعہ بھیجا:

آن کیست کہ جسم ملک را جان باشد — آن کیست کہ ہمسر سلیمان باشد
آن کیست کہ انجمش بفرمان باشد — کس نیست مگر کلبِ علی خان باشد

۵/ رجب ۱۲۸۴ھ کو ایک قطعہ مدحیہ پندرہ اشعار کا نواب کی نذر کیا:

ہند میں اہل تسنن کی ہیں دو سلطنتیں — حیدرآباد دکن رشک گلستان ارم
رام پور اہل نظر کی ہے نظر میں وہ شہر — کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
حیدرآباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ — اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور کہ ہے — مرجع و مجمع اشراف نژاد آدم
رام پور ایک بڑا باغ ہے از روے مثال — دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں — ہے اُسی طور پہ یاں دجلہ فشان دستِ کرم
ابر دست کرم کلب علی خان سے مدام — در شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبح دم باغ میں آ جائے، جسے ہو نہ یقین — سبزہ و برگ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبذا باغ ہمایونِ تقدس آثار — کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالان حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس — خضر بھی یاں اگر آ جائے تو لے ان کے قدم
مدح کے بعد دعا چاہیے، اور اہل سخن — اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم
حق سے کیا مانگیے ان کے لیے، جب ہو موجود — ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم

ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل   دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم

یا خدا غالب عاصی کے خداوند کو دے   دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم

اولاً عمر طبیعی بہ دوامِ اقبال   ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہ امم

اگلے سال جمعہ ۲۸ رمضان ۱۲۸۴ھ کو عید کے موقع پر قطعۂ تہنیت نذر کیا:

داد و دہش تو روز افزون باد   بر دولتِ تو زمانہ مفتون باد

این عید و دو صد ہزار عید دیگر   بر ذاتِ تو فرخ و ہمایون باد

نواب کلب علی خان سے غالب کے تعلقات میں تھوڑی سی کشیدگی بھی آگئی تھی اور اُس کا سبب یہ تھا کہ غالب نے ملا غیاث الدین رام پوری مؤلف غیاث للغات کے بارے میں کچھ تلخ اور نازیبا الفاظ لکھ دیے تھے۔ انہوں نے یہ نہ سوچا، یا شاید انہیں علم نہ تھا کہ ملا غیاث الدین نواب کلب علی خان کے استاد بھی تھے۔ غالب کو اپنی فارسی دانی کا جو دعویٰ تھا وہ اُن کے سفر کلکتہ کی رہ آورد تھا اور ایک complex بن کر ساری زندگی اُن کا پیچھا کرتا رہا۔ غیاث اللغات کی اہمیت اور افادیت کو اہل ایران نے بھی تسلیم کیا ہے اور یہ لغت کئی بار ایران میں چھپ چکی ہے مگر غالب اسے ''لتۂ حیض'' جیسے ناشایستہ الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ نواب اُن کی تنقید سے دل برداشتہ ہوئے اسی لیے غالب کو ان کی مدح کے بہانے بار بار ڈھونڈنے پڑے، لیکن انہیں جو مالی امداد ملتی تھی وہ کسی نہ کسی صورت میں جاری رہی اگرچہ اس میں نہ اضافہ ہوا نہ غالب کی امید برآری ہوئی۔ نواب کلب علی خان سے غالب کے تعلقات کی روداد مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے بھی بہت تفصیل سے لکھی ہے اور ایک بہت اثر انگیز مقالہ جناب مالک رام کا نوائے ادب بمبئی میں شائع ہوا تھا جو اُن کے کسی مجموعہ مضامین میں ہوگا۔

آخر میں رامپور رضا لائبریری کے ارباب اختیار خصوصاً ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی افسر بکار خاص کی توجہ ایک اہم نکتے کی جانب مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ نوابان رام پور کے

نام غالب کے خطوط کو نہایت مفید اور مفصل حواشی اور مقدمہ کے ساتھ مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم نے ''مکاتیب غالب'' کے نام سے شائع کر دیا تھا اور اس کے کئی ایڈیشن چھپے۔ ظاہر ہے کہ خطوط اور مدحیہ اشعار کا متن غالب کے قلم سے لکھے ہوئے خطوط و قصائد سے ہی لیا گیا تھا۔ اب وہ اصل خطوط اور اشعار کہاں ہیں؟ دارالانشاء کے بستے اسٹیٹ آرکائیوز الہ آباد کو منتقل کر دیے گئے جہاں حشرات الارض اُن سے غذا حاصل کر رہے ہوں گے۔ یہ ہرگز یقین نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا عرشی جیسا صاحب نظر محقق ان اصلی دستاویزوں کو پوٹلی میں باندھ کر آرکائیوز کے حوالے کر سکتا تھا۔ اُن بستوں کا تفصیل سے جائزہ لینے کے لیے محکمۂ ثقافت سے خصوصی گرانٹ لے کر دو تین اسکالرز کو الہ آباد میں متعین کرنا چاہیے یا اُس ذخیرے کو واپس لانے کی سنجیدہ کوشش ہونی چاہیے۔

والیانِ رامپور سے متعلق غالب کے قطعات وقصاید

ریاست رامپور سے غالب کے روابط ہمیشہ استوار رہے۔ اس ریاست سے غالب کے تعلقات اسی زمانے میں قائم ہو گئے تھے جب نواب سیّد غلام محمد خاں خلف نواب سیّد فیض اللہ خاں، ریاست میں داخلی کشمکش کے باعث دہلی چلے آئے تھے[1]۔ غالب کے معاصر یہاں کے نوابوں نے غالب کی پذیرائی کی۔ وہ ہمیشہ اس ریاست سے متمتع ہوتے رہے۔ مستقل وظیفے کے علاوہ انہیں یہاں سے وقتاً فوقتاً عطیات بھی دیے جاتے رہے۔ ریاست کے اسی التفات کی وجہ سے غالب دوبار رامپور آئے اور ریاست کے مہمان رہے۔

نواب سیّد یوسف علی خاں نے دہلی میں قیام کے دوران مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا فضل حقِ خیرآبادی اور غالب دہلوی سے عربی اور فارسی پڑھی تھی۔ نواب یوسف علی خاں نے ۱۸۵۵ء میں ریاست کی باگ ڈور سنبھالی تو غالب نے انہیں ایک مختصر قطعۂ جلوس

ارسال کیا اور مبارکباد پیش کی، لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں آیا۔ ۲۸ر جنوری ۱۸۵۷ء کو مولانا فضل حق خیر آبادی کے کہنے پر غالب نے ایک فارسی قصیدہ اور ایک عرضداشت نواب صاحب کو ارسال کی۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

به نواب یوسف علی خاں فرستم ہمانا اگر گوہر جاں فرستم

غالب نے اس قصیدے میں اس طرح اپنے فن کا تعارف کرایا ہے اور نواب یوسف علی خان کی مدح سرایی کی ہے:

شقائق به بنگاهِ نعمان فرستم گرفتم که رنگین خیالم به گیتی
چراغی به مهر درخشان فرستم گرفتم که روشن روانم به دانش
گهر جانب ابر نیسان فرستم گرفتم که بحر روانم به معنی

اس کے بعد نواب یوسف علی خاں نے شاعری میں غالب کی شاگردی اختیار کی۔

ایک بار نواب یوسف علی خاں کی طرف سے خط و کتابت میں تغافل برتا گیا تو غالب نے شکایت کے طور پر ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:

دانم که تو دریایی و من سبزۂ ساحل چون نیست مرا شربت آبی ز تو حاصل

نواب یوسف علی خاں نے انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں کی جدوجہد میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ہندستانی اپنی کوششوں میں ناکام ہوئے، لیکن نواب صاحب کو انگریز نوازی کے صلے میں بریلی کا ایک علاقہ دیدیا گیا۔ غالب نے توقیع بریلی کی مبارکباد پیش کی۔

نواب یوسف علی خاں کے لڑکے حیدر علی خاں کی شادی پر تہنیتی قطعے نظم کیے۔ یہ شادی ۱۲۷۷ء میں عمل میں آئی تھی۔ نواب یوسف علی خاں نے جب بیماری سے شفایاب ہوئے تو غالب نے تہنیت کے طور پر تاریخ کہی۔

نواب یوسف علی خاں اور ان کے جانشین نواب کلب علی خاں کے نام غالب

کے اردو خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ اگر نوابان رامپور نے غالب کی خاطر مدارت کرنے میں حتی الوسع کوشش کی، تو غالب نے بھی اپنے قصاید میں اس کا حق ادا کر دیا۔ نواب یوسف علی خاں جن کو غالب نے ''ناظم'' تخلص تجویز کیا تھا اور جن کے اشعار پر غالب اصلاح دیتے تھے، غالب سے بے تکلف ملتے جلتے تھے۔ غالب نے نواب یوسف علی خاں کے نام اپنے خطوط میں انہیں اکثر حضرتِ ولی نعمت، آیہ رحمت'' سے مخاطب کیا ہے اور حد ادب کا خیال رکھا ہے لیکن وہ ایک خط میں نواب صاحب کو حتیٰ ''تم'' سے بھی خطاب کرتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ غالب ان روابط میں اپنی استادی کا فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ یہ خط مختصر ہے، لیکن دلچسپ، ملاحظہ ہو:

> آدابِ نیاز بجالا کر عرض کرتا ہوں کہ سو روپے کی ہنڈوی بابت مصارفِ ماہِ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی اور روپیہ وصول میں آیا اور صرف ہو گیا اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں، اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجھ کو اور بھیج دیجے گا تو جلا لیجے گا، لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو''

ایک بار نواب یوسف علی خاں نے غالب کے خطوط کا جواب دینے میں تغافل برتا۔ اسی دوران انگریزوں نے بریلی کو ان کی ریاست میں شامل کر دیا۔ غالب نے ایک قصیدے میں نواب صاحب کے تغافل کی شکایت کی اور ''بریلی'' عطا ہونے پر تہنیت پیش کی۔ یہ قصیدہ تاریخی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے اور اس میں چند اشعار غالب کی پرواز خیال اور ندرتِ بیان کے ترجمان ہیں۔ اس کا مطلع ہے:

چوں نیست مرا شربتِ آبی ز تو حاصل — دانم کہ تو دریابی و من سبزۂ ساحل

نواب صاحب غالب کی طرف سے تغافل برت رہے تھے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ بظاہر

مجھے آپ سے پانی کا شربت بھی حاصل نہیں ہو رہا، لیکن میری حیثیت دریا کے ساحل پر اُگے پودوں کی مانند ہے، انہیں سینچنے کے لیے پانی دیا جائے یا نہیں، وہ ساحل دریا پر ہونے کی وجہ سے، زیر زمین ہی نمی حاصل کرتے رہتے ہیں اور پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔ غالب بھی ریاست رامپور سے اپنی اسی نوعیت کے روابط کا ذکر کر رہے ہیں کہ نواب صاحب کا ہر حال میں ان پر التفات ناگزیر ہے۔

ایک دوسرے بیت میں وہ نواب صاحب کے نام سے فائدہ اٹھاتے ہیں، انہیں یوسف ثانی کہتے ہیں اور ہر عاقل و دیوانے کو ان کے جمالِ پرنور کا مشتاق قرار دیتے ہیں:

اے یوسف ثانی کہ بود در ہمہ عالم مشتاق جمال تو، چہ دیوانہ، چہ عاقل

ایک بیت میں وہ کہتے ہیں کہ یہ استاد ازل کی صنعت ہے کہ اس نے تیری طرف اسی طرح مجھے مائل رکھا ہے جیسے قبلہ نما کا ہمیشہ قبلے کی طرف رخ ہوتا ہے۔

از صنعت استاد و ازل دان کہ ز ہر سوی چون قبلہ نما سوی توام ساختہ مائل

وہ نواب یوسف علی خاں کو یہ باور بھی کرا رہے ہیں کہ شعر و شاعری میں عرفی و طالب کی بات نہ کرو، اس کی آیات و نشانیاں تو صرف خاص طور پر مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔

محمد نجم الغنی صاحب نے لکھا ہے کہ "۲۳ رجون ۱۸۶۰ء کو بہ صلۂ خیر خواہی غدر لارڈ کیننگ صاحب گورنر جنرلِ ہند نے ۱۳۳۶ مواضعاتِ جمعی ایک لاکھ اٹھائیس ہزار پانسو ستائیس روپے چار آنے کے، ہمیشہ کے واسطے عطا فرمائے۔ اول یہ تجویز ہوئی کہ پرگنۂ کاشی پور دیا جائے مگر بعد ازاں جو محلہ سرساوان، اُجاؤں، سرولی کا علاقہ دیا گیا۔ یہ علاقہ ضلع بریلی کے شمال کی سمت سے جنوب کی جانب ایک پتلی دھجی کے طور پر چلا گیا ہے۔"

غالب نے نواب صاحب کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

بریلی کا ملک ملنے کی تہنیت دی تھی۔ بعد اس کے حضرت کو دامنۂ کوہ کی محال یعنی کاشی پور ملا، گویا میری تحریر غلط ہوگئی۔ الحمد للہ انجام کار جو میں نے قصیدے میں قصد کیا تھا، وہی ہوا۔

غالب کے اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ انہیں یہ اطلاع تھی کہ نواب صاحب کو بریلی کا علاقہ دیا گیا ہے، لیکن بعد میں کاشی پور کے دیے جانے کا اعلان ہوا، لیکن بالآخر دیا گیا بریلی کا وہ علاقہ جسے نجم الغنی نے دھجی کہا ہے اور اس پر غالب کو خوشی ہوئی کہ جو کچھ انہوں نے نظم کیا تھا، ویسا ہی ہوا، اور اس لیے نواب صاحب کو انہیں لسان الغیب سمجھنا چاہیے:

توقیع بریلی بہ تو فرخند، کہ من نیز　　بستم بہ فرہ مندی خویش از کرمت دل

ایک دوسرے قطعے میں بھی وہ جدید علاقہ ملنے پر نواب صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں، لیکن یہاں وہ علاقے کا نام نہیں لکھتے اور کہتے ہیں:

چون غنچہ ای کہ پہلوِ گل شگفد بہ باغ　　ملک جدید شامل ملک قدیم باد

اور نواب صاحب سے خلعت کے خواہاں ہیں:

مقصود از لباس ہمان بوشش تنست　　بوشش گر از حریر نباشد گلیم باد

۱۲۷۷ھ میں صاحزادہ سیّد حیدر علی خان خلف اوسط کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ نواب یوسف علی خاں نے سول اور ملٹری ملازمین کو جوڑے اور خلعت مرحمت فرمائے۔ شہر میں کھانا تقسیم کرایا گیا۔ روشن باغ سے عروس کی رہایش گاہ تک، جس کا فاصلہ کچھ کم تین میل تھا دورویہ روشنی اور آتشبازی کا لطف قابلِ دید تھا۔ اس تقریب پر ایک لاکھ نو ہزار ایک سو اسی روپے پانچ آنے صرف ہوئے۔[۱۲]

غالب نے اس تقریب پر دو تہنیتی قطعے کہے، ایک مختصر لیکن دوسرا نسبتاً طویل۔ مختصر قطعِ تاریخ ہے جس کا مطلع ہے:

دیدہ ور یوسف علی خاں کز فروغِ رای او　　مہر تابان برد قسطِ فیض و من ہم یافتم

ان دونوں قطعوں میں غالب نے سیّد حیدر علی خاں کو ولیعہد ریاست لکھا ہے:

از ولیعہدش سخن رانم کہ چون ماہِ منیر　　طلعتش را دیدہ روشن سازِ عالم یافتم

نواب یوسف علی خان کو صاحبزادہ سیّد حیدر علی خاں سے اپنے فرزندوں میں

سب سے زیادہ لگاؤ تھا اور وہ انہیں اپنا ولیعہد اور جانشین بنانا چاہتے تھے، لیکن ایسا ہوا نہیں اور نواب سیّد کلب علی خاں ان کے جانشین ہوئے۔

حالاں کہ غالب کو تاریخ کہنے میں تأمل ہوتا تھا اور وہ حساب کتاب سے گھبراتے تھے، لیکن اس تقریب کی جو تاریخ غالب نے کہی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور فن تاریخ گوئی سے غالب کی مکمل آشنائی کی ترجمان بھی:

سال این دولت فزا شادی بہ امعانِ نظر مشتری با زہرہ در طالع فراہم یافتم

اس میں مشتری (۹۵۰) + زہرہ (۲۱۷) + طالع (۱۱۰) سے ۱۲۷۷ سال تقریب نکلتا ہے۔

تہنیتی قطعہ کا مطلع ہے:

بہار ہند کہ نامند برشگال آن را پس از دو سال بر اہل جہان مبارکباد

ہندوستان میں بہار کو برسات کا موسم کہتے ہیں، یہ بہار ساری دنیا والوں کو دو سال کے بعد آنے پر مبارک ہو۔ ممکن ہے دوسری متواتر بارش نہ برسی ہو اور قحط کی صورت رہی ہو، اور غالب اسی صورت حال کی طرف اشارہ کر رہے ہوں۔ اسی قطعے کے دو شعر یہ ہیں جو اس خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں:

بہ باغ و کشت و بیاباں و کوہ سر تا سر سحاب و سبزہ و آبِ روان مبارکباد

گذشت عہد سموم و زید باد خنک ز جاں بہ تن دگر از تن بہ جان مبارکباد

اس قطعے میں غالب خود اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ولی عہد کی شادی پر خاص طور پر رامپور کو مبارکباد کیوں دی جائے؟ خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ چوں کہ رامپور اس موقع پر ساری دنیا کے لیے بہار کا سبب بن گیا ہے اس لیے یہاں سے جو چیز بھی صورت پذیر ہو رہی ہے، اس پر سب کو مبارکباد دینی چاہیے:

معاف باشم اگر خود ز خویشتن برسم بہ رامپور خصوصاً چسان مبارکباد

چو رامپور بود وجہ تازہ روئی دہر ز ہر چہ این ہمہ گل کرد آن مبارکباد

نواب سیّد یوسف علی خان ۱۲۸۱ھ میں سرطان میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ دن کے بعد انہیں افاقہ ہوا تو غسل صحت ہوا۔ باغِ بے نظیر میں ایک زبردست جشن بھی منایا گیا۔ دربار رامپور سے وابستہ شعرا نے تاریخیں کہیں۔ غالب نے بھی ایک قطعۂ تاریخ کہا جس میں تین لفظوں سے تین تاریخیں ہیں، فراغ، اختر نیک، خجستہ روز

ایک فراغ و اخترِ نیک و خجستہ روز پیداست زین سہ لفظ سہ تاریخ دلپذیر

چوں کہ مادۂ مرض مکمل طور پر زائل نہیں ہوا تھا، اس لیے ان کی طبیعت پھر سے خراب ہوگئی اور اسی سال ۱۲۸۱ھ/۲۱/اپریل ۱۸۶۵ء کو جمعے کے دن ان کا انتقال ہو گیا۔

غالب نواب کلب علی خان کے دور میں بھی رامپور آئے تھے۔ اس وقت کا مشہور واقعہ ہے کہ جب غالب رامپور میں تھے تو نواب صاحب کو سفر پر جانا پڑا۔ غالب بھی خدا حافظ کہنے والوں میں شامل تھے۔ نواب صاحب نے غالب سے کہا کہ آپ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں، غالب کی بذلہ سنج طبیعت نے جواب دیا کہ خدا نے آپ کے سپرد کیا تھا اور آپ مجھے خود اسی کے سپرد کر رہے ہیں۔

۱۔ غالب: غلام رسول مہر، طبع چہارم، لاہور، ص ۲۰۳

۲۔ اخبار الصنادید، ج ۲، محمد نجم الغنی، رامپور رضا لائبریری، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۰

۳۔ خطوط غالب، ۶۸۹

۴۔ اخبار الصنادید، ص ۱۱۷

اسلم پرویز

غالبؔ کے تلامذۂ رام پور

اصلاحِ سخن کے حوالے سے

'تلامذۂ غالب' مولفہ مالک رام جی کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ غالبؔ کے ان شاگردوں کی تعداد جن کا تعلق رام پور سے تھا، کل گیارہ ہے۔ ان گیارہ کے نام یہ ہیں:

(۱) حکیم مظہر احسن خاں احسنؔ رام پوری (۲) حکیم فتحیاب خاں اخگرؔ رام پوری (۳) صاحب زادہ عباس علی خاں بیتابؔ رام پوری (۴) شیخ عبدالسمیع انصاری بیدلؔ رام پوری (۵) صاحب زادہ عبدالوہاب خاں سروشؔ رام پوری (٦) نادر شاہ خاں شوخیؔ و شوخ رام پوری (۷) شہاب الدین خاں شہاب رام پوری (۸) حافظ خان محمد خاں شہیر رام پری (۹) عبداللہ خاں محشرؔ رام پوری (۱۰) سیّد افتخار الدین مغلوبؔ رام پوری اور (۱۱) نواب محمد یوسف علی خاں بہادر ناظمؔ رام پوری۔

'خطوطِ غالب' مرتبہ خلیق انجم (پانچ جلد) سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان گیارہ تلامذہ

میں سے غالب کی خط و کتابت صرف دو کے ساتھ تھی۔ ان میں سے ایک فرمانروائے رام پور نواب محمد یوسف علی خاں بہادر ناظم اور دوسرے انھی کے سگے چچازاد بھائی اور نواب محمد عبدالعلی خاں بہادر کے فرزند صاحب زادہ عباس علی خاں بیتاب رام پوری تھے۔ اپنے بقیہ شاگردوں کے ساتھ غالب کی خط کتابت کیوں نہیں تھی جب کہ دیگر اہلیانِ رام پور کے ساتھ بھی جو ان کے شاگرد نہیں تھے ان کا سلسلۂ مراسلت جاری تھا اس سوال کے جواب تک پہنچنے کے لیے ابوالکلام آزاد سے منسوب شاید وہ روایت ہماری کچھ رہ نمائی کر سکے جو 'تلامذۂ غالب' میں مالک رام نے غالب کے شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رام پوری کے ذیل میں نقل کی ہے۔ روایت اس طرح ہے:

"..... جب میرزا ۱۸۶۰ء میں فردوس مکان نواب محمد یوسف علی خان بہادر کی دعوت پر رام پور تشریف لے گئے تو شوخی وہاں موجود تھے۔ یہ غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح کی درخواست کی۔ میرزا کا اصول یہ تھا کہ چوں کہ میں دربارِ رام پور کا وظیفہ خوار ہوں اس لیے رام پور میں والیِ ریاست کی اجازت کے بغیر کسی کو شاگردی میں قبول کرنا ٹھیک نہیں۔ انھوں نے شوخی کو بھی یہی جواب دیا اور ان کے کلام پر اصلاح دینا منظور نہ کیا۔ شوخی اس جواب سے مایوس تو بہت ہوئے لیکن ہمت نہ ہارے۔ چند دن بعد جب یہ پھر خدمت میں حاضر ہوئے تو میرزا نے کہا کہ شراب کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے اور یہ صرف مراد آباد میں مل سکتی ہے اور ملازموں میں کوئی اس اہم خدمت کے سرانجام دینے کا اہل نہیں۔ شوخی نے اپنی خدمات پیش کیں گھر آئے منت سماجت کر کے والد سے دام لیے اور

ایک کی جگہ پانچ بوتلیں لا کے غالب کی خدمت میں پیش
کردیں۔ جب غالبؔ نے قیمت ادا کرنا چاہی تو انھوں نے
لینے سے انکار کردیا۔ اگلے دن جب یہ پھر حاضر ہوئے تو
میرزا نے پوچھا کہ بھئی وہ تمہاری غزل کہاں ہے جس پر تم
اصلاح لینا چاہتے تھے،انہوں نے جھٹ سے کاغذ جیب سے
نکال کر سامنے رکھ دیا۔ میرزا نے جگہ جگہ اصلاح دی اور ساتھ
ساتھ اصلاح کے وجوہ بیان کرتے گئے''۔

(تلامذۂ غالب، مکتبہ جامعہ ۱۹۸۴ء، ص ۳۱۹)

اس روایت کی روشنی میں قیاس کہتا ہے کہ شاید ایسے ہی کچھ معاملات غالبؔ کے دیگر
شاگردان رام پور کے ساتھ بھی رہے ہوں لیکن اس امر میں خط کتابت افشائے راز کا
موجب ہوسکتی تھی جو شاید غالب نہیں چاہتے تھے۔

خلیق انجم کے مرتبہ 'خطوطِ غالبؔ' تیسری جلد میں ناظمؔ کے نام غالبؔ کے
چالیس خطوں میں احتیاج، وظیفے اور درباداری کے امور ہی زیادہ ترمعرضِ بحث میں آئے
ہیں اصلاحِ سخن کی جانب صرف ایک اشارہ ہے وہ بھی براہِ راست یا بالتفصیل نہیں، غالب
کہتے ہیں:

''حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں
کلامِ خوش مطلوب ہے۔ اگلی غزلوں کی طرح نہ ہوں۔ مگر اگلی
غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی اور ان اشعار میں کلامِ خوش نہ تھا۔
حضرت کا تو ان غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ شاید اوروں کے
دیوان میں ویسا ایک شعر بھی نہ نکلے گا۔ میں بقدر اپنے فہم و
استعداد کے بھی اصلاح میں قصور نہیں کرتا''۔

(خطوطِ غالب، مرتبہ خلیق انجم، جلد سوم، ص ۸۳۔۱۸۲)

نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم کے نام پہلے ہی خط مورخہ ۱۵ر فروری ۱۸۵۷ء سے بس ایک بات کی اور نشان دہی ہوتی ہے کہ نواب صاحب اپنا تخلص بھی یوسف ہی رکھنا چاہتے تھے جس کے جواب میں غالب نے پانچ تخلص تجویز کیے۔ لکھتے ہیں:

''میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسمِ سامی اور نامِ نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیساں، ان میں سے جو پسند آئے وہ رہنے دیجیے۔ مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک''۔

(خطوطِ غالب، مرتبہ خلیق انجم، جلد سوم، ص ۱۱۷۹)

چناں چہ اس خط کے حاشیے میں خلیق انجم لکھتے ہیں:

''غالب نے پانچ تخلص تجویز کیے تھے جن میں سے نواب یوسف علی خاں کو 'ناظم' پسند آیا۔ نواب صاحب نے یکم مارچ ۱۸۵۷ء کے خط میں غالب کو لکھا 'منجملۂ الفاظِ تخلص (ناظم) مطبوعِ طبعِ نیاز گشت''۔

(خطوطِ غالب، مرتبہ خلیق انجم، جلد سوم، ص ۱۳۸۲)

کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم ۱۹۳۷ء میں رام پور اسٹیٹ کے چیف منسٹر تھے۔ 'مکاتیب غالب' مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی کے آغاز میں انھوں نے کتاب کی جو 'تقریب' رقم کی ہے اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''....۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک دربارِ رام پور میں میرزا غالب کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری رہا اس مراسلت کا معتد بہ حصہ محکمہ عالیہٗ دارالانشا (پولٹیکل ریکارڈ آفس) رام پور میں محفوظ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں احقر نے اعلیٰ حضرت بندگانِ حضور پر نور

کپتان ہز ہائنس عالی جاہ، فرزندِ دل پذیرِ دولت انگلشیہ، مخلص الدولہ ناصر الملک امیر الامرا نواب سیّد رضا علی خاں بہادر مستعد جنگ کے سی ایس آئی فرمانروائے رام پور دام اقبالہم و ملکہم کی توجہ ہمایوں اس نادر و نایاب ذخیرے کی اشاعت کی طرف مبذول کرنے کی جرأت کی"۔

(مکاتیبِ غالب، ص ۸)

اس عبارت کا یہ ٹکڑا کہ 'اس مراسلت کا معتد بہ حصہ محکمہ عالیہ دار الانشا رام پور میں محفوظ تھا، غور طلب ہے۔ چوں کہ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ تلمیذِ غالبؔ بھی تھے اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ غالب کے وہ خطوط جن میں انھوں نے فرمانروائے ریاستِ رام پور نواب سیّد محمد یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں المتخلص بہ ناظمؔ کے کلام پر اصلاحیں دی تھیں انہیں نواب صاحب کے وقار اور دبدبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے عمداً محفوظ نہ رکھا گیا ہو اور اس طرح نواب یوسف علی خاں ناظمؔ اور غالبؔ کے درمیان اصلاحِ سخن کے معاملات روشنی میں نہ آسکے۔

صاحب زادہ عباس علی خاں بیتابؔ رام پوری کے نام غالبؔ کے صرف دو ہی خط ہمارے سامنے ہیں جو خطوطِ غالب مرتبہ خلیق انجم کی جلد چہارم میں شامل ہیں۔ اصلاحِ سخن کی رو سے غالبؔ کے ان دو ہی خطوں سے شعر پر اصلاح دینے کے غالب کے انداز پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اصلاحِ سخن کے اساتذہ کے ہاں عام طور پر دو طریقے دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں سے ایک کو پیشہ ورانہ اور دوسرے کو خلاّقانہ قرار دیا جاسکتا ہے، پہلا طریقہ استادی برائے استادی اور دوسرا سخن سنجی اور سخن فہمی سے عبارت ہے۔ پیشہ ور استاد کے سامنے جب شاگرد کا کوئی شعر آتا ہے تو استاد، شاگرد کے مافی الضمیر کو سمجھ کر اصلاح دینے کے بجائے شاگرد کے شعر کی زمین میں اپنے خیال و کمال کے گھوڑے دوڑانے لگتا ہے اور اصلاح کے نام پر ایک بالکل دوسرا ہی شعر شاگرد کو ودیعت کردیتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان 'اصلاحِ سخن کے متعلق میرے خیالات' ہے اس

طریقۂ استادی کی سخت مذمت کی ہے اور بیشتر اساتذۂ سخن کو اسی زمرے میں شمار کیا ہے۔ وہ اس مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ''مثل مشہور ہے کہ 'ناؤ کس نے ڈبوئی' خواجہ خضر نے اس مثل کو واقعات کی شکل میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''ہماری شاعری کا بیڑا کس نے غرق کیا، استادوں نے'' بھلا آپ ہی غور کیجیے شاعری کو استادی شاگردی سے کیا مطلب۔ ایک شخص ہے کہ دلی جوش سے کچھ لکھتا ہے، وارداتِ قلبی کو الفاظ میں ادا کرتا ہے، آپ بیتی دلی درد کے ساتھ دوسروں کو سناتا ہے اور استاد صاحب ہیں کہ ٹھنڈے دل سے اس پر اس سرے سے اس سرے تک قلم پھیر دیتے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ اس لیے کہ وہ استاد ہیں۔ ان کا حق ہے کہ اصلاح دیں۔ ان کا فرض ہے کہ باپ دادا کی سنت پر شاگرد کو چلائیں۔ اگر مانے تو اس کی شاعری کو میر و سودا کی پرانی شاعری کا نمونہ بنا دیں اگر نہ مانے تو 'نالائق' کہہ کر شجرے سے اس کا نام نکال دیں''۔

(مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین [انتخاب]، مطبوعہ اردو اکادمی دہلی، مرتبہ اسلم پرویز، ص ۱۹۲)

اس کے بعد مرزا صاحب نے اصلاح کی بہت سی دل چسپ مثالیں پیش کی ہیں جن میں سے چند آپ کی ضیافتِ طبع کے لیے حاضر ہیں:

قبل اصلاح:

صورت حال یہ، آئینۂ رازِ دل ہے
رنگ چہرے کا سرِ بزم ہوا ہو جانا

بعد اصلاح:

آئے ہو بادِ بہاری کی طرح دیکھ تو لو
رنگ رُخ کا دمِ دیدار ہوا ہو جانا

--

قبل اصلاح:

اے قافلۂ یاس گزر دل میں نہ ہوکر
پامال نہ کر گورِ غریبانِ تمنا

بعد اصلاح:

اے صرصرِ غم واسطہ اُس غیرت گل کا
برباد نہ کر رنگِ گلستانِ تمنا

--

قبل اصلاح:

شب کو ہے وحشیوں کے آبلۂ پا کی جھلک
جا بجا راستے روشن ہیں بیابانوں کے

بعد اصلاح:

غول کے غول چلے آتے ہیں دیوانوں کے
راستے بند نہ ہوجائیں بیابانوں کے

غالب کا شمار بجا طور پر ان اساتذۂ سخن میں ہے جو ہمارے نزدیک استادانہ کے بجائے خلاقانہ کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہاں استاد، شاگرد کی شاعرانہ انفرادیت کے وقار کو ٹھیس پہنچائے بغیر ایک اشارے میں اسے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے داغ کی صرف ایک مثال پیش ہے۔ احسن مارہروی کا شعر تھا:

دیکھنے کے لیے آیا ہے زمانہ اس کو
اک تماشا ہے مسافر بھی سفر سے پہلے

داغ نے صرف دو نقطوں کو نیچے سے اوپر کر کے شعر کو فصاحت کے درجۂ کمال کو پہنچا دیا:

دیکھنے کے لیے آتا ہے زمانہ اس کو
اک تماشا ہے مسافر بھی سفر سے پہلے

ہمارے زمانے میں ایسے باکمال استادوں میں ایک بسمل سعیدی ٹونکی مرحوم بھی تھے۔ ایک سیاسی رہ نما کی شان میں امیر قزل باس کی ایک نظم کا مصرع تھا:

اِدھر کشتی کا رخ موڑا اُدھر ساحل نظر آیا

بسمل صاحب نے برجستہ اصلاح دیتے ہوئے کہا:

جدھر کشتی کا رخ موڑا اُدھر ساحل نظر آیا

اس تمہید کے بعد آیئے اب چلتے ہیں بیتابؔ کے چند اشعار پر غالب کی اصلاحوں کی جانب۔

بیتابؔ کے اشعار کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ معمولی درجے کے شاعر تھے۔ معاملات فصاحت کی بات تو الگ رہی ان کے ہاں زبان، املا اور تقطیع کی اغلاط بھی ہوا کرتی تھیں اس لیے غالبؔ نے ان کے اشعار پر فصاحت کے نکات کے تحت جو اصلاحیں دیں ان کے ساتھ ساتھ اغلاط کی بھی نشاندہی کی ہے۔ غالبؔ نے بیتابؔ کے نام اپنے ان کل دو خطوں میں لگ بھگ پونے دو سو اشعار پر اصلاح دی ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے اس کی دوسری مثال 'خطوطِ غالب'، مرتبہ خلیق انجم کی پانچوں جلدوں میں بھی اور کہیں نہیں ہے۔ سبب؟ بیتابؔ فرمانروائے رام پور کے سگے رشتے دار تھے۔

بیتابؔ کے ہاں املا کی اس نوع کی غلطیاں عام دکھائی دیتی ہیں جہاں وہ دو لفظوں کو تشدید کے ذریعے اس طرح پیوست کر دیتے ہیں کہ وہ ایک لفظ بن جاتا ہے۔ یعنی وہ ''اس سے'، 'جس سے' اور 'کس سے' وغیرہ کے درمیان 'س' کو مشدد کر کے لکھ دیتے ہیں جیسے اُسّے، جِسّے، کِسّے۔ یہی نہیں 'پک کے' یعنی 'پک کر' کو بھی وہ تشدید کے ساتھ 'پکّے'

لکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر:

وہ بات کرو جس سے نہ ہوں نالہ و افغاں
بے چین اُدھر رہتے ہو تم اور اِدھر ہم

اسی طرح املا میں وہ امالے کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ ایک شعر میں انہوں نے 'اشارہ' ہائے ہوز سے لکھا ہے جب کہ وہ یائے مجہول کا محل تھا:

نہیں تلوار کے آنے کی بھی اب کچھ حاجت
تیرے ابرو کے اشارہ ہی نے مارا قاتل

اسی طرح 'دونوں' کی بیانیہ شکل کو خطابیہ کے انداز میں بغیر نون غنہ "دونو" لکھا ہے:

بہاتے ہیں تو دو دریا بہائیں چشم تر دونو
فغاں و نالہ ہیں تو ہوں مگر ہیں بے اثر دونو

بیتاؔب کے ہاں املا کی براہِ راست اغلاط بھی ہیں جن کی جانب غالبؔ نے اشارے کیے ہیں۔ مثلاً اس شعر میں فصد اور فصاد دونوں کو بجائے ص کے س سے لکھا ہے:

ضعف میں رگ تو کہاں ہاتھ نہیں ہاتھ آیا
کیوں تری فسد سے حیرت میں نہ فساد رہے

اب چند مثالیں معیار فصاحت سے متعلق جہاں واقعی لائق استاد شاگرد کو کچھ سکھاتا ہے۔ بیتاؔب کے ایک شعر کو غالب نے اولاً قلم زد کر دیا لیکن بعد میں خفیف سی تبدیلی کر کے اسے فصیح کر دیا اور لکھا کہ "میں نے اس شعر کو ناحق کاٹا "جوروکا" یہ لفظ مکروہ تھا 'جو' کو 'جب' لکھ دیجیے شعر صاف اور بے عیب ہو جائے گا۔ بیتاؔب کا شعر تھا:

گریہ و زاری کو جب کا تو سودا ہوگیا
ہوگئے ہم ضبط کرنے سے فضیحت اور بھی

یہاں 'جو' کے ساتھ 'روکا' رول کر ایک نظر میں 'جورو' پڑھا جاتا تھا اس لیے غالب نے 'جو' کو

'جب' سے بدل دیا۔ اس موقعے پر داغ کا ایک واقعہ یاد آتا ہے ہوسکتا ہے داغ کے پیش نظر بیتاب کی یہ مثال رہی ہو۔ داغ نے 'برا لگنے' محاورے پر احسن مارہروری کو ایک شعر موزوں کر کے لکھوایا:

معشوق سے شکایتِ جور و جفا ہے جرم
اس کو بری لگے تو خدا کو بری لگے

شعر مکمل کرتے ہیں ذہن 'جورو' کی طرف منتقل ہوا جو بادی النظر میں جورو' پڑھا جاتا تھا چناں چہ فوراً ہی پہلے مصرعے کو بدل کر اس طرح کر دیا:

معشوق سے شکایتِ بیداد جرم ہے

اسی طرح جلال کے ایک شاگرد کاوش نے ایک مرتبہ یہ مصرع پڑھا:

خود کنویں میں گر پڑے جوروے دلبر دیکھ کر

مصرع سن کر داغ نے کہاں میاں کاوش استاد کو دکھا کر غزل پڑھا کرو، پھر برجستہ مصرع یوں درست کیا:

جو کنویں میں گر پڑے خود روئے دلبر دیکھ کر

بیتاب کا شعر تھا:

ہونی ہے جو خلق پر بس اب یہیں ہو جائے گی
فتنہ محشر ہوا صدقے تری رفتار پر

غالب ''یہی ہو'' کو 'یہیں' سے اور 'قرباں' کو 'صدقے' سے بدل دیا۔

بیتاب کا شعر تھا:

اپنے ہاتھوں سے کر کے کام تمام
نوحہ کرنے کو چارہ گر بیٹھے

یہاں 'نوحے' جمع کے صیغے کے ساتھ غیر فصیح ہے غالب نے اسے 'نوحہ' کر دیا۔

مثالیں بہت ہیں آخر میں بیتابؔ کا اک قطعہ ملاحظہ فرمایئے جس کے ہر مصرعے
پر غالبؔ نے صاد بنایا ہے:

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ
ساقی اگر نہیں تو نہو، مے سے کام ہے
بیتابؔ پی خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ
یہ خُم ہے یہ سبو ہے یہ شیشہ، یہ جام ہے

اس کے بارے میں غالبؔ لکھتے ہیں 'واللہ کیا ذوق انگیز قطعہ ہے، خُم سے سبو میں، سبو سے شیشے میں، شیشے سے جام میں، اس تقدیم و تاخیر کا مزہ میں ہی جانتا ہوں'۔

وقارالحسن صدیقی

غالب کا قیامِ رامپور

مرزا غالب دہلوی ولد عبداللہ بیگ ولد قوقان بیگ ولد شہزادہ ترسم خاں[1] ولادت آگرہ ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء، قیام دہلی کی وجہ سے دہلوی کہلاتے ہیں۔ انہیں رام پور میں قیام سے پہلے دہلی کے لال قلعہ میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ بہادر کا خطاب اور شاہی استادی کا مرتبہ عطا فرمایا تھا[2] لیکن اسی دربار میں ان کی مشکل پسندی کا مضحکہ اڑانے والے مولوی عبدالقادر غمگین رامپوری (صاحب وقائع عبدالقادر خانی) بھی موجود ہوتے تھے۔ جو تمسخرانہ انداز میں اس شعر کو غالب کا بتا کر تعریف کرتے تھے[3]:

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہو گُل بھینس کے انڈے سے نکال

ظاہر ہے کہ غالب کو اس طرح کے اشعار کہنے پڑے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ز بسکہ مشکل ہے کلام میرا اے دل سن سن کر اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل[۴]

بیاورید دریں جا بود سخن دانی غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

اس کے باوجود دلّی والے ان کی بے راہ روی، خود پسندی، مذہب بیزاری سے خوش نہیں رہے۔ ان کے روابطِ بھی شرفائے دہلی کے مخصوص حلقوں میں محدود تھے۔ اُن میں مولوی صدرالدین آزردہ، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن اور علامہ فضل حق خیر آبادی کے علاوہ کچھ بگڑے ہوئے رؤسا جن میں لوہارو کے نواب شمس الدین احمد خاں رام پور کے نواب محمد سعید خاں و نواب عبداللہ خاں بھی تھے۔ سعید خاں کے فرزند محمد یوسف علی خان کی ولادت و تعلیم بھی دہلی میں ہوئی تھی اور انہوں نے علامہ فضل حق کے علاوہ غالب سے بھی فارسی کے چند اسباق پڑھے تھے[۵]۔

نواب شمس الدین خاں پر جنرل فریزر کو قتل کروانے کا الزام لگا تھا غالب پر مخبری کا شبہ کیا گیا۔ کیوں کہ نواب صاحب سے غالب کی پنشن کا مقدمہ بھی چل پڑا تھا۔ دوسری طرف شمس الدین خاں کے لڑکے نواب مرزا داغ اپنی خالہ عمدہ خانم کے پاس آگئے تھے جو نواب یوسف علی خاں کی متوسلہ تھیں[۶]۔

جب نواب محمد سعید خاں کو ریاست رام پور کا والی مقرر کیا گیا تو ان کے چھوٹے بھائی محمد عبداللہ خاں نے غالب کو مشورہ دیا کہ نئے والی ریاست کو تہنیتی قطعہ لکھ کر بھیجیں[۷]۔

لیکن مرزا غالب اس وقت اپنی پنشن کی بحالی اور مقدمے کی مصروفیات کے باعث اس طرف توجہ نہ دے سکے اور عبداللہ خاں کے مکتوب کے جواب میں حالات کی ناسماعدت کا عذر کیا۔

''خدام بلند مقام کہ سرانجام قصیدہ، بقصدِ نام آوری از غالب

بینوا چشم داشتہ اند۔ مگر اٰن فرسودہ رواں افسردہ دل را کہ ہنوز نمردہ
است۔ زندہ پنداشتہ اند[8]

نواب محمد سعید خاں کی جشنِ تاج پوشی میں مومن خاں شریک ہوئے تھے۔ ان کے قطعۂ تہنیت میں ایک یہ شعر بھی ہے:

رام پور اک زمانِ ممتد سے تیرے مقدم کا تھا تمنائی

لیکن جب یوسف علی خاں سریرِ آرائے حکومت ہوئے تو غالب نے اپریل ۱۸۵۵ء میں قطعۂ تاریخِ جلوس لکھ کر بھیجا۔ مگر دربارِ رامپور سے کوئی جواب نہ گیا[9]۔ غالب کا دل شاعری کی طرف سے ہٹ گیا مگر کچھ عرصہ بعد ان کے عزیز دوست مولانا فضل حق خیرآبادی جو رام پور میں حاکم مرافعہ تھے انہوں نے نواب صاحب کو غالب کا کلام سنا کر مشورہ دیا کہ مرزا صاحب کو رام پور بلا لیا جائے۔ جس سے نواب صاحب کا اشتیاق بڑھ گیا۔ اور اپنے کلام پر اصلاح لینے کا شوق پیدا ہو گیا۔ انہوں نے ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو ڈھائی سو روپے کی ہنڈوی اور مندرجہ ذیل مکتوب روانہ کیا۔

''مشفقا! ہر چند کہ کاتب را اتفاقِ موزونیت یک مصرعہ ہم نشدہ بود لیکن محض بجہتِ سماعتِ کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدرالوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود، چوں سبیلی بہ ازیں بنظرم نہ رسید، لہٰذا چند ابیات واہیات موزوں نمودہ، بترصدِ اصلاح پیشِ آن یگانۂ آفاق مرسل گشت چشمداشت کہ بعدِ اصلاح غزلہای مذکور مع کدام طرحِ جدید لطف فرمودہ شوند[10]''

لیکن بعض محققین جن میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں، کا کہنا ہے کہ صرف اصلاحِ کلام کی نہ تھی[11]۔ اس خیال کو تقویت اس مفروضہ سے ملتی ہے کہ غالب کے ۳۶۴ خطوط میں

صرف ۱۲۶ منظر عام پر آئے۔ باقی خطوط مرزا غالب کی ہدایت "از دستِ مبارک چاک نمودہ شد" کے مطابق ضائع کر دیئے گئے۔

اور انہیں لکھ دیا گیا کہ آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ خط پھاڑ دیا گیا اور آئندہ بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔[۱]

اس سلسلے میں بطور انکسار نواب یوسف علی خاں کی تحریر کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ ہم نشدہ بود" سے بدگمانی ہو سکتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مومن نے یوسف علی خاں کی بعہد ولی عہدی دہلی آمد پر جو تاریخی قطعہ "تاریخ آمدن یوسف علی خاں بہادر" لکھا ہے اس کے اشعار میں کہیں بھی تلمذِ مومن یا پرانے تخلص یوسف کا ذکر نہیں[۲] ہے لیکن آگے "چند ابیاتِ واہیات موزوں نمودہ" کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

مگر مولانا ابوالکلام آزاد نے "چاک نمودہ شد" آئندہ ہم در بارۂ ہم چو مکاتیب ایمائے سامی ملحوظ خواہد شود پر ہی سوال اٹھایا ہے کہ یہ احتیاط کیوں بڑھ گئی۔ بظاہر ہے میرزا غالب اور نواب صاحب کی خط و کتابت اصلاحِ شعر سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن کیا ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں سے دو ماہ پہلے دہلی میں سیاسی انقلاب اور فوجی بغاوت کے چرچے نہیں ہو رہے تھے؟ بہ سلسلۂ تاریخ غدر ۱۸۵۷ء سے جواب اثبات میں ملتا ہے۔ عجب نہیں کہ غالب نے ان اُمور پر روشنی ڈالی ہو اور اس لیے احتیاطِ متقاضی ہو کہ یہ خطوط چاک کر دیئے جائیں۔[۳]

غالباً یہی وجہ تھی کہ رامپور روانگی کو غالب نے قریب ترین اصحاب و تلامذہ سے بھی پوشیدہ رکھا اور اثنائے راہ میں مختلف مقامات کا عازم بتایا۔ میرٹھ پہونچ کر حکیم غلام نجف خاں کو مطلع کیا۔

"ہاں بھائی! میں از روئے مصلحت اپنے کو مقاماتِ مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں۔ اب جو شخص تم سے پوچھا کرے اس سے پردہ

نہ کرنا۔ اور صاف کہہ دینا کہ رام پور کو گیا ہے۔ یعنی سب کو معلوم ہو جائے اور کوئی تذبذب میں نہ رہے۔

اپنے ایک اور عزیز ترین شاگرد منشی ہر گوپال تفتہ (جنہیں وہ اپنی اولاد کہتے تھے) کو ۲۱ر جنوری ۱۸۶۰ء کے مکتوب میں رام پور روانگی کی اطلاع دی جس سے انہیں حیرت اور افسوس بھی ہوا۔ مگر حسین مرزا کو ۳۱ر دسمبر ۵۹ء کے مکتوب میں تحریر کیا کہ "رام پور زندگی میں میرا مسکن اور بعدِ مرگ میرا مدفن ہو لیا۔"[۱۵]

اس کے برعکس تفتہ کو غالب سے یہ امید نہ تھی کہ ان سے بھی روانگی رامپور کو مخفی رکھا جائے گا کیوں کہ وہ خود غالب کے ذریعے ریاست رامپور سے وابستہ ہونا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ غالب کے والیانِ ریاست سے گہرے مراسم ہیں۔ مگر غلطی سے غالب کے مزاج کے برخلاف تفتہ نے غالب کے نام جو خط لکھا اس کے پتے میں معرفت شیخ وجیہ الزماں لکھ دیا۔ جس سے ناراض ہو کر اوائل فروری ۱۸۶۰ء میں غالب نے لکھا کہ:

"صاحب! تمہارے یہ اوراق سکندر آباد سے دلّی اور دلّی سے رامپور پہنچے۔ یقین ہے کہ رامپور سے میرے بھیجے ہوئے سکندر آباد پہنچے ہوں گے۔ سوائے ایک مصرع کے مجھے اور جگہ اصلاح یاد نہیں۔ تم جو اپنے فرزند کو ناشناسائے مزاجِ روزگار کہتے ہو۔ خود اس میں کیا کم ہو؟ پہلے تو یہ بتاؤ کہ رامپور میں مجھے کون نہیں جانتا؟ کہاں مولوی وجیہ الزماں صاحب، کہاں میں۔ ان کا مسکن میرے مسکن سے دور پھر درِ دولتِ رئیس کہاں اور میں کہاں؟ چار دن والی شہر نے اپنی کوٹھی میں اتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اس میں رہتا ہوں۔ بہ حسب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس

ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دلی سے خط چلے آتے
ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام۔ محلے کی اور عرف کی
حاجت نہیں۔ بلکہ در دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے
شاید خط تلف ہو جائے۔ دوسری بات جو تم نے لکھی ہے وہ بھی
مطابقِ واقع ومناسب حال نہیں۔ اگر اقامت قرار پائی تو تم کو
بلالوں گا[۱۶]۔

اس خط سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ غالب اور نواب رامپور کا تعلق محض اتفاقیہ طور پر استادی شاگردی کا یا مولانا فضل حق خیر آبادی کی سفارش کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ یہ خط و کتابت بھی برائے بیت ہی تھی۔ غالب کو سرکاری محل میں ٹھہرانا اور پھر کار پردازانِ ریاست کے مقابلے میں زیادہ اہمیت مل جانا اور پھر دو تین حویلیوں کا ملنا یونہی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ مرزا صاحب کی بیگم دہلی میں تھیں۔ زنانہ حویلی کی علیحدہ ضرورت نہیں تھی۔

اس کے باوجود عام طور پر یہی مشہور کیا گیا کہ غالب نواب صاحب کے استاد کی حیثیت سے تشریف لائے ہیں۔ حالانکہ بعد میں نواب یوسف علی خاں کی شاعرانہ صلاحیتیں جو مومن کے انتقال کے بعد دم توڑ گئی تھیں دوبارہ ابھرنے لگیں۔ مگر ان کا جو کلام بھی ملتا ہے وہ مختلف کاتبوں کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ جس پر غالب نے اصلاحیں دی ہیں[۱۷]۔

ان اصلاحوں کا مطالعہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ واقعی نواب یوسف علی خاں کو شعر گوئی کا ملکہ حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ بعض محققین سید ہاشمی فرید آبادی نے الناظر میں، شیخ محمد اکرام نے غالب نامہ، اور نقدِ غالب میں کلام ناظم کو غالب کا زائیدۂ فکر قرار دیتے ہوئے انہیں شریک غالب تک کہا[۱۸]۔ لیکن کلام غالب اور ناظم کے موازنے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دونوں کا رنگِ سخن مختلف ہے۔

منشی ہر گوپال تفتہ کے نام جو خط اوپر نقل ہوا اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان کے

رہائشی مکان کا محل وقوع کیا تھا۔ یعنی اس زمانے میں یہاں شہر کا مرکزی ڈاک خانہ تھا۔ اور اس سے قلعہ کافی فاصلے پر واقع تھا جب کہ راج دوارہ میں قیام گاہ کے طور پر جس عمارت کی نشاندہی ہوئی ہے اِس وقت وہاں کوئی پوسٹ آفس نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں سے منتقل ہوکر پہلے موجودہ پان دریبہ کے پاس مرکزی پوسٹ آفس بنا۔ جواب سٹی پوسٹ آفس کہلاتا ہے۔ مرکزی پوسٹ آفس گاندھی پارک کے نزدیک منتقل ہو چکا ہے۔

قیام گاہ کے بارے میں عرشی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''بزرگانِ شہر سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ محلہ راج دوارہ کی اس شاہ راہ پر جو خاص باغ پیلیس کو جاتی ہے۔ مفتی احمد یار خاں کے مکان کے محاذ میں ڈاک خانہ تھا۔ اور میرزا صاحب نے اس کے متصل مکان میں قیام کیا تھا۔ چوں کہ یہ مکان اردو ادب کے نیّرِ رخشاں (غالب) کا فرودگاہ رہ چکا تھا۔ ۲۱ر فروری ۱۹۴۴ء کو اس پر یادگاری پتھر لگایا گیا۔ ۲۲ر فروری کو نواب صاحب رامپور نے ایک نمائندہ ادبی اجتماع کے روبرو اس کی نقاب کشائی فرمائی [۱۹]۔ یہ عمارت امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مختلف مالکان کے قبضے میں جانے کے بعد اب لکشمی نواس کا روپ دھار چکی ہے۔ اس کا شکستہ کتبہ راقم الحروف نے رضا لائبریری کے میوزیم کے لیے حاصل کر کے محفوظ کر لیا ہے۔

حسین مرزا کے نام اپنے خط میں جو غالب نے ۳۱ر دسمبر ۱۸۵۹ء کو لکھا ''رامپور کو زندگی میں اپنا مسکن اور بعد مرگ مدفن قرار دیا ہے [۲۰]۔

اسی طرح قیام رام پور کے سلسلے میں غالب نے دیگر خطوط میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ وہ تاریخی و تحقیقی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ غالب نے میر مہد

مجروح کو لکھا۔

"یہ رامپور ہے۔ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے۔ وہ اور کہاں ہے۔ پانی، سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے اتنا شیریں کہاں ہوگا[۲۱]۔

مرزا صاحب نے رامپور میں کتنی مدت قیام کیا اس مسئلہ پر اُن کے بعض خطوط سے روشنی پڑتی ہے۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں۔

میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔ چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دتی آیا[۲۲]۔

منشی ہر گوپال تفتہ کے نام اپنے مکتوب میں تحریر کیا۔

نواب یوسف علی خاں بہادر بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینہ رہ کر چلا آیا[۲۳]۔

نواب علاء الدین خاں علائی کو لکھا۔

سال گزشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا[۲۴]۔

ان خطوط میں چھ سات ہفتے کچھ دن کم دو مہینے اور دو ماہ کا تذکرہ ہے۔ مگر کچھ دن کم دو مہینے صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ غالب ایک ماہ بیس یوم رام پور میں رہے تھے[۲۵]۔

قیام رامپور کے دوران میرزا صاحب کے لیے ابتدا میں سرکاری باورچی خانے سے کھانا آتا رہا۔ خود غالب کا بیان ہے کہ "کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے۔ اور سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا بھی میرے خلاف طبع نہیں۔۔۔ چند روز بعد کھانے کے سو روپے مقرر

کر دیے گئے[۲۶]۔

رامپور میں غالب کو تو ماحول، آب و ہوا کھانا سبھی کچھ پسند تھا۔ مگر ان کے گود لیے بیٹے یعنی زین العابدین خاں کے دونوں بیٹے باقر علی خاں اور حسین علی خاں انہیں پریشان کرتے تھے۔ اس لئے جب انہوں نے دلی کا قصد کیا تو اس کے لیے تنخواہ میں کٹوتی کی صورت پیدا ہوئی۔ میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

''اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے مہینہ بنامِ دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپے مہینا پاؤں اور دلّی رہوں تو سو روپے۔''[۲۷]

حکیم غلام نجف خاں کو آب و ہوا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ! اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربتِ صاف ہے۔ سبک گوارہ ہاضم سریع النفوذ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو خوب بھوک لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، مگر ہاں ایک عنایت اللہ دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا[۲۸]۔

قیام رام پور کے دوران نواب صاحب کو اصلاح دینے کا کیا طریقہ تھا۔ وہ کس طرح فنی خوبیاں واضح کرتے تھے یا اس سے متعلق دیگر تفصیلات کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ لائبریری میں صرف ایک بیاض ملتی ہے جس پر غالب کے قلم سے اصلاحیں موجود ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ اصلاحیں دورانِ قیام رامپور کی ہی ہوں۔

البتہ اس عہد میں غالب کو اپنا دیوان محفوظ کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کے دواوین کے متعدد نسخے ہیں۔ پہلے نسخے کے بارے میں نواب شمس الامراء کو اگرچہ غالب نے لکھا تھا

کہ میں نے طاق نسیاں پر رکھ دیا۔ اور ایک دوسرے شاگرد کو تحریر کیا کہ "اس میں بڑی تعداد میں پرانے اشعار موجود ہیں۔ جب کہ رام پور کے قدیم ترین نسخے میں ۱۰۶۷ اشعار ہیں [۱۲]۔ اور نواب ضیا الدین احمد خاں نے ۱۲۵۴ھ کی اپنی ایک تقریظ میں ۱۰۷۰ سے زیادہ اشعار کی نشاندہی کی ہے [۱۳]۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز سے کچھ دن پہلے میرزا غالب نے اردو کلیات کا ایک قلمی نسخہ نواب یوسف علی خاں کو بطور تحفہ ارسال کیا تھا۔ اس وقت تک یہ غالب کا مکمل ترین اور قابل اعتماد، اصلاح شدہ کلام تھا۔ جو دواوین اس وقت تک شائع ہو چکے تھے۔ ان سے غالب خود ہی غیر مطمئن تھے۔ اور کسی اناڑی یا کم سواد شخص کو اس کی کتابت وطباعت اور اشاعت کی ذمہ داری دینا نہیں چاہتے تھے۔ اتفاق سے کچھ تاجرانِ کتب و احباب کی خواہش تھی کہ دیوانِ غالب کی طباعت و اشاعت کا موقع انہیں مل جائے۔ ان کے مخلص دوستوں میں منشی شیونرائن نے بھی فرمائش کی تب انہیں ایک مکتوب میں تفصیل سے نہ چھپوانے کی وجہ لکھی تھی اور بتایا تھا کہ میرٹھ کے ایک کتب فروش عظیم الدین احمد نے قیام رامپور کے علاوہ میرٹھ پہونچنے پر بھی اس کی تمنا کی اور نواب مصطفیٰ خاں کی سفارش اور تصحیح کی ذمہ داری پر وعدہ کرنا پڑا تھا۔ چونکہ دلّی سے رام پور چلتے وقت انہوں نے نواب یوسف علی خاں والے نسخہ کی ایک نقل ضیاء الدین احمد خاں کو بھیج دی تھی۔ لہٰذا دہلی واپسی پر ضیاء الدین احمد خاں سے اس کو مانگ کر شیفتہ کو روانہ کر دیا۔

غالب نے اپنا دیوان میرٹھ میں چھپنے نہ دیا اور مطبع شیونرائن آگرہ میں تاخیر ہوئی تو ان سے لے کر محمد حسین خاں تحسین سے لکھنؤ میں شائع کروادیا۔

اس میں مخطوطۂ رام پور کی تقریظ جوں کی توں شامل ہے۔ البتہ غلط نامے میں ضرور ترمیمات کی گئی ہیں [۱۴]۔

ظاہر ہے کہ ریاست رامپور کو اس معاملے میں بھی اولیت حاصل ہے کہ نواب

رام پور کی فرمائش پر پہلی مرتبہ قلمی نسخہ ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو انتخاب کر کے بھیجا گیا۔ اس کی کتابت نواب فخرالدین خاں بہادر نے کی تھی۔ اس کی تصحیح انہوں نے اپنے قلم سے کی ہے۔ اسے غالب نے صوری و معنوی تمام خوبیوں سے مرصع و مزّین کیا بقول عرشی صاحب اس کو دو مرتبہ ترتیب دیا گیا۔ اس طرح یہ نسخہ ہی میرزا غالب کا آخری پسندیدہ ایڈیشن ہے[32]۔

رام پور سے متعلق ایک اور نسخہ ''انتخاب غالب'' ہے۔ یہ خود غالب کا کیا ہوا پہلا انتخاب ہے جو رضا لائبریری کے ذخیرہ میں شامل ہے۔ اس میں ہندی کے کسی مہا کوی اور اردو کے اہم شاعر نواب ہدایت علی خاں ہدایت شاگرد مومن (نواب یوسف علی خاں کے چچیرے بھائی) کی ذاتی بیاض ہے۔ اس کی ابتداء و آخر میں کسی نامعلوم کوی کے ہندی کبت ہیں۔ صفحہ ۱۴۰ سے کسی صنعت نامی شاعر کا کلام ہے۔ پھر میرزا غالب کا قطعہ چکنی ڈلی اور ایک رباعی ہے۔ سوادِ خطِ مجہول ہونے پر بھی یہ نسخہ غالب کا سب سے پرانا ہونے کے باعث اہمیت کا حامل ہے[33]۔

۱۸۶۰ء میں غالب نے فارسی کی مشہور فرہنگ برہان قاطع کی غلطیاں واضح کرنے کے لیے ایک رسالہ قاطع برہان کے نام سے لکھا۔ جو نواب یوسف علی خاں کی امداد سے زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس کے جواب میں کئی رسالے لکھے گئے۔ ایک صاحب مرزا رحیم بیگ نے رسالہ ساطع برہان لکھا۔ غالب نے ساطع برہان کا جواب تحریر کر کے نواب مرزا داغ کی وساطت سے نواب کلب علی خاں کو پیش کیا تھا[34]۔

عہد نواب یوسف علی خاں ناظم کے بعد نواب کلب علی خاں کا زمانہ بظاہر زبردست تبدیلیوں کا پیش خیمہ تھا کیوں کہ نواب ناظم ان کے ہم مزاج ہم مسلک و آشنا اور ہم مشرب تھے۔ وہ نئے والیٔ ریاست سے ان سہولیات و روابط کے متوقع نہیں تھے۔ لہٰذا جب کلب علی خاں نوابؔ نے مسند نشین ہو کر غالب کو رام پور آنے کی دعوت دی[35] تو مرزا غالب کو رامپور جانے میں تردد تھا اور رام پور پہونچ کر اپنے گھر و احباب کو مطلع کرنا پڑا کہ

اس سلسلے میں ''جو بات میں نے تم نے کہی تھی وہ غلط ہے اوس کی کچھ اصل نہیں ہے [۳۵]

غالب کی قیام گاہِ رام پور کے بارے میں مشہور ہے کہ پہلے پہل نواب یوسف علی خاں نے انہیں اپنی خاص کوٹھی میں ٹھہرایا تھا۔ اس کے بعد راج دوارہ کی دو تین وسیع حویلیاں دی گئیں۔ لیکن دوسری مرتبہ جب وہ کلب علی خاں کے زمانے میں رامپور آئے تو راج دوارہ کی حویلیوں میں نہیں ٹھہرے۔ اس کے بجائے قلعہ کے نزدیک جرنیلی کوٹھی انہیں عطا کی گئی اس طرح رام پور میں یہ غالب کی تیسری قیام گاہ تھی۔

عام طور پر لوگوں کو صرف راج دوارہ کی قیام گاہ معلوم ہے اور اسکی وجہ یہ ہوئی کہ جرنلی کوٹھی قلعۂ معلّی کے مشرقی دروازے کے باہر واقع تھی۔ اس کے کافی عرصہ بعد عہدِ نواب حامد علی خاں رشک میں قدیم عمارتیں منہدم کرا کے از سرِ نو بنوائیں تو جرنیلی کوٹھی بھی ٹوٹ پھوٹ میں آگئی اور اس کی اراضی قلعہ کی توسیع میں آگئی [۳۷]۔ اس مرتبہ بھی رامپور میں غالب مطمئن و مسرور تھے۔ لہٰذا نواب علاء الدین خاں علائی کے نام اپنے خط میں نواب کلب علی خاں کی قلمی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

> ''رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں، قد، رنگ، شکل، شمائل، بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں۔ عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت، حلیم، خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، شعرفہم، سیکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائی طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبین ایسے کہ اون کے دیکھنے سے غم کوسوں دور بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ اون کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔
>
> اَللّٰھُمَّ دَامَ اِقبالُہ، و زادَ اجلالُہ [۳۸]

نواب کلب علی خاں کے بارے میں منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک مکتوب میں غالب نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

"نواب صاحب از روی صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق آیۂ رحمت ہیں۔ خزانہ غیض کے تحویلدار ہیں۔ الخ" [۳۹]

غالب نے نواب کلب علی خاں کے جشنِ جمشیدی (تخت نشینی) پر ایک فارسی نثر اور تیں اشعار کا قصیدہ پیش کیا [۴۰]۔

یادگارِ غالب میں مولانا الطاف حسین حالی نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ جب نواب کلب علی خاں کمشنر بریلی سے ملاقات کے لیے تشریف لے جارہے تھے تو رخصت کے وقت غالب نے بھی کورنش ادا کی۔ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا کہ "خدا کے سپرد"

میرزا صاحب کی شوخ طبیعت نے گدگدایا اور آپ قدرے حزیں صورت بنا کر بولے "حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے۔ آپ پھر الٹا مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں [۴۱]۔

کیوں کہ غالب کے قیامِ رام پور کا پہلا دور عہدِ نواب یوسف علی خاں (تخت نشینی ۱۸۵۵، وفات ۱۸۶۵ء تک) بہت سکون سے گذرا تھا حالاں کہ اس میں یہ بھی شرط تھی کہ رام پور ہیں تو دو سو روپے ماہانہ اور دہلی رہیں تو سو روپے ملتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ جس زمانے میں کسی معذوری کے باعث غالب اصلاح نہ کر پائے تب بھی اس میں کوئی کٹوتی نہیں ہوئی۔ مگر نواب یوسف علی خاں ناظم کے آنکھیں بند کرتے ہی نظامِ ریاست میں بڑی تبدیلیوں کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ غالب کا خیال تھا کہ ان کی جو پذیرائی نواب ناظم کے عہد میں ہوئی اور داد و دہش سے نوازا گیا وہ سب عہد نواب کلب علی خاں میں نہیں رہے گا۔ ان کے بعض احباب واقربا بھی متردد تھے۔ مگر بہت جلد غالب کی یہ بدگمانی دور ہوگئی جس کا اظہار ۲۱ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کے مکتوب میں غلام نجف خاں سے بھی کیا ہے۔

”تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ تنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں، خمیری چپاتیاں، مربے، اچار۔ میں بھی خوش لڑکے بھی خوش، کلو اچھا ہوگیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے“[۲۲]

چناں چہ غالب نواب کلب علی خاں کے رویئے سے اتنا متاثر ہوئے کہ بعض معاملات میں انہیں نواب ناظم پر ترجیح دینے لگے۔ حکیم غلام رضا خاں کو تحریر کرتے ہیں۔

نواب صاحب حال بمقتضائے اَلوَلدُ سِرٌ لِأَبیہ حسنِ اخلاق میں نواب فردوس مکاں آرام گاہ کے برابر بعض شیوہ و روش میں اُن سے بہتر ہیں[۲۳]

مرزا غالب کا ارادہ تھا کہ رامپور میں دو چار مہینے قیام کریں گے۔ لیکن بہت جلد انہیں احساس ہوگیا کہ وہ زیادہ نہیں رک سکیں گے کیوں کہ نواب کلب علی خاں اپنے والد کی طرح عزت و آسائش کا خیال تو رکھتے تھے مگر نہ تو شاعری میں باقاعدہ تلمذ اختیار کیا اور نہ ہی راز و نیاز کی باتیں ہی ہوتی تھیں۔ دوسری جانب باقر علی خاں اور حسین علی خاں جو جوانی کی منزلوں میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے بھی کچھ مسائل تھے۔ لہٰذا غالب نے واپسی کا ارادہ کرلیا۔ اس میں بھی ان دونوں کی علیحدہ اجازت ضروری تھی۔ چناں چہ باقر علی خاں و حسین علی خاں نواب صاحب کے دربار میں حاضر ہوئے۔ اور باقاعدہ مراجعت کی اجازت دلا کر ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو دو آدمیوں کے ساتھ رخصت کردیا۔ نواب صاحب نے اسی وقت ان کو ایک ایک دوشالہ مرحمت فرمایا تھا[۲۴]

خود مرزا صاحب ۲۸؍دسمبر ۱۸۶۵ء کو رامپور سے رخصت ہوئے۔ نواب صاحب ۳۰؍اکتوبر ۱۸۶۵ء تک ان کو ایک ہزار روپے عطا فرما چکے تھے۔ اس کے بعد ۲۶؍دسمبر کو مزید دو سو روپے رخصتانہ دے کر ان کی یہ آرزو بھی پوری کر دی۔

نواب کلب علی خاں سے ملاقات کر کے جب مرزا غالب اپنی قیام گاہ پر آئے تو وہاں انہیں الوداع کہنے کے لیے رام پور کے کچھ احباب موجود تھے۔ انہیں مخاطب کر کے مرزا غالب نے فرمایا:

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالب
آج ہم حضرت نواب سے بھی مل آئے

چوں کہ اس واقعہ کو مفتی انتظام اللہ شہابی نے ''لطائف غالب'' میں عہد نواب یوسف علی خاں کا بتایا ہے مگر یہ درست نہیں، مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحقیق کے مطابق جب کہ وہ بذاتِ خود کم سِن رہے ہوں گے اُن سے ایک سن رسیدہ بزرگ نجابت علی خاں نے اپنے بچپن کا واقعہ بتایا کہ وہ اپنے والد صاحبزادہ ہدایت علی خاں کے ہمراہ غالب کی قیام گاہ پر موجود تھے اور انہوں نے اپنے احباب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ''بھئی، ہم نے ابھی یہ شعر کہا ہے:

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالب
آج ہم حضرت نواب سے بھی مل آئے

چوں کہ اس واقعے سے پہلے ہی غالب نے اپنا دیوان مرتب کر کے اس کا ایک نسخہ نواب صاحب کو اور دوسرا نسخہ دہلی میں ضیاء الدین احمد خاں کو روانہ کر دیا تھا۔ اسلیے مذکورہ شعر اس میں شامل نہ ہو سکا۔

گورنر جنرل لارڈ لارنس نے نواب کلب علی خاں کو لیجس لیٹو کونسل کا ممبر نامزد کیا تھا۔ ۱۸۶۶ء کو نواب صاحب کونسل میں شرکت کرنے کلکتہ گئے اور ۱۸۶۷ء کو واپس

آئے[۵]۔ غالب نے اس موقع پر قطعۂ تاریخ لکھ کر کسی اخبار میں چھپوانے کی اجازت طلب کی تھی۔ اس کے بعد ریاستی سرپرستی میں اخبار دبدبۂ سکندری جاری ہوا تو غالب نے مدحیہ رباعی لکھ کر اس درخواست کے ساتھ روانہ کی کہ اسے اخبار کے سرنامے پر شائع کیا جائے[۶]۔

قیام رام پور کے دوران غالب کے تعلقات عمائدینِ شہر سے ہو گئے تھے، ان میں منشی امیر احمد مینائی بھی تھے۔ منشی صاحب نے اپنا کلام منشی شیونرائن کے اخبار ''معیار الشعرا'' میں اشاعت کے لیے بھیجا اس وقت تک ان کی شہرت رام پور سے باہر نہ نکلی تھی۔ جب معیار الشعراء میں کلام کی رسید اور عدمِ اشاعت کا عذر شائع ہوا تو مرزا غالب نے شیونرائن کو مندرجہ ذیل خط لکھا تھا:

''اب کے تمہارے ''معیار الشعراء'' میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی۔ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں۔ ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا۔ ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں۔ اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور وہ اب رامپور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو[۷]۔''

ظاہر ہے کہ رام پور آ کر خود غالب کو وہ مرتبہ حاصل ہو چکا تھا کہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے سفارشی خطوط بھیجتے تھے۔ جب آرام و اطمینان فارغ البالی بڑھتی ہے تو انسان سے لغزش بھی ہو سکتی ہے۔ چناں چہ ان کے قدم رامپور میں بھی پرانی روش پر چلنے لگے۔ نواب کلب علی خاں کو جوا کھیلنے کی اطلاع ہوئی تو ایک روز انہوں نے دریافت کیا کہ ''میرزا صاحب کیا اب بھی یہ شوق جاری ہے۔''

غالب نے صفائی پیش کی کہ ''نہیں، البتہ کچھ قلندرانہ لین دین ہو جاتا ہے[۸]۔''

غالب نے نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں دونوں کے لیے مدحیہ اشعار کہے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ممدوح کا نام شامل نہ ہونے کی وجہ سے ممدوح کا تعین مشکل ہو جاتا ہے۔ چناں چہ ۳۶/اشعار پر مشتمل قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

مرحبا، سال فرخی آئیں   عید شوال و ماہِ فروردیں

کے بارے میں مولانا نظامی بدایونی نے "پیارے لال رونق" مدیر رسالہ کمال کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ نواب کلب علی خاں کے جشنِ صحت پر لکھا گیا۔ اسے انہوں نے غیر مطبوعہ بھی قرار دیا ہے۔ لیکن یہی قصیدہ ۱۷/مارچ ۱۹۱۶ء کے دبدبۂ سکندری میں شائع ہو چکا ہے۔ مولانا عرشی کے مرتبہ مکاتیب غالب سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، کیوں کہ منشی سیل چند میر منشی ریاست رامپور کے نام غالب نے ۲۵/دسمبر ۱۸۶۴ء اور ۸/جنوری ۱۸۶۵ء کے درمیان ایک خط تحریر کیا ہے۔ جس سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ قصیدہ نواب کلب علی خاں کے بجائے نواب یوسف علی خاں کے غسلِ صحت کے جشن کے موقع پر تحریر ہو چکا تھا۔

ممکن ہے یہ غلط فہمی کلب علی خاں کے تخلص "نواب" کی وجہ سے ہو۔

محفلِ غسلِ صحت نواب
رونق افزائے مسندِ تمکیں

مگر قصیدہ میں عید، نوروز اور ہولی کا ملاپ بقول امیر مینائی نواب یوسف علی خاں کے غسلِ صحت پر ہی ممکن ہوتا تھا[۹]۔

مرزا غالب اپنے فارسی کلام کو اردو پر ترجیح تو دیتے تھے مگر اردو کی مقبولیت کے پیش نظر انہوں نے خود اپنی زندگی میں کئی مرتبہ کلامِ اردو شائع کرانے کی کوشش کی۔ لیکن جس طرح زندگی کے ہر معاملے میں نفاست اور اعلیٰ معیار کا خیال رکھا تھا دیوان کی طباعت بھی اسی لحاظ سے معیاری کرانے کی کوشش کی۔ مگر کوئی بھی نسخہ ان کے معیار پر پورا نہیں اترا

تھا۔ البتہ قیام رامپور کے دوران انہوں نے بلحاظ ترتیب و تصحیح خود کئی مرتبہ دیوان کا انتخاب کیا۔ ان میں سے معتبر ترین نسخہ منشی احمد علی شوق قدوائی نے جب کہ وہ ریاست رام پور سے وابستہ تھے۔ مولانا نظام بدایونی کی درخواست پر فراہم کیا تھا۔ جو ۱۹۲۲ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔

اسی طرح جب نواب کلب علی خاں نے ۱۸۶۵ء میں فارسی اردو اساتذہ کے منتخب اشعار کی بیاض تیار کی تو غالب کو ۲۵/ اگست ۱۸۶۶ء میں تحریر کیا کہ:

''راقم کو ترتیب بیاضِ اشعارِ منتخبہ اساتذۂ پارسی و اردو کی منظور ہے اس لیے حوالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ انتخاب دیوان فارسی اور اردو اپنے کا فرما کر مع انتخاب کلام ضیاء الدین خاں صاحب لطف کریں۔

نواب صاحب کے خط کے جواب میں ۱۰/ ستمبر کو غالب نے تحریر کیا کہ:

''اردو کا دیوان ایک شخص کو دیا ہے۔ فارسی دیوان کا شیرازہ کھول کر چند شخصوں کے حوالے کیا جائے گا۔ بعد اتمامِ تحریر نذر کیا جائے گا۔

اس کے بعد ماہ ستمبر میں اردو دیوان نقل ہو کر اس خط کے ساتھ آیا کہ

''خاطرِ اقدس میں نہ گزرے کہ غالب تعمیل احکام میں کاہل ہے۔ بصارت میں فتور، ہاتھ میں رعشہ، حواس مختل۔ ناچار کاتب کی تلاش کی۔ شہر سراسر ویران ہے۔ کاتب کہاں؟ بارے ایک دوست نے کاتب کا نشان دیا۔ اردو دیوانِ اشعار، اشعار پر صاد کر کے اس کے حوالے کیا۔ کل وہ اجزائے منقولہ آئے۔ آج بطریق پارسل مع اس عرضی کے ارسال کیے۔ خط کاتب کا مجھ کو

پسند نہیں آیا۔ حضرت کو کیوں کر پسند آئے گا۔ اغلاط اتنے تھے کہ مجھ کو تحریر کے برابر محنت کرنا پڑی۔

فارسی کی بیاض کا شیرازہ کھول کر اجزاء اس کے احباب پر تقسیم کر دیئے ہیں جا بجا اشعار پر صاد کر دیئے ہیں۔ وہ بھی میرے انتخاب کے مطابق نقل ہو رہے ہیں۔ بعد اتمام وہ بھی پیش کروں گا[۵۱]

اسی ماہ میں فارسی دیوان کا انتخاب بھی مرتب ہو گیا۔ ۲۷ ستمبر کو میرزا صاحب نے اس کا پارسل رام پور روانہ کرتے ہوئے نواب کلب علی خاں کو لکھا۔

''اردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں۔ یقین ہے کہ حضرت کی نظر سے گزر گیا ہو۔ آج فارسی دیوان کا انتخاب بطریق پارسل اس عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں، اس درویش نے صرف غزلوں اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔ قصائد و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا۔ اگر حکم ہو تو وہ بھی بھیجوں۔

نواب کلب علی خاں بہادر نے دونوں کی وصولیابی کی اطلاع ۳۰ ستمبر کے مکتوب میں دی۔ اور قصائد قطعات، مثنویات طلب نہیں فرمائیں۔ یہ آخری انتخاب میرزا صاحب کے آخری ذوقِ شاعری کا نمونہ ہے۔ ۱۹۴۲ء میں شایع ہو چکا ہے[۵۲]

مرزا غالب کے رام پوری شاگردوں میں نواب یوسف علی خاں ناظم سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ بلکہ غلط فہمی کی بنا پر کچھ محققوں نے انھیں شریکِ غالب بھی قرار دے دیا تھا۔ جو تحقیق کے بعد غلط ثابت ہو گیا۔ کیوں کہ رضا لائبریری میں نواب صاحب کا وہ کلام موجود ہے جس پر غالب کے قلم سے اصلاحیں ہیں۔

مرزا غالب کی شاگردی سے پہلے نواب ناظم کا تخلص یوسف تھا۔ لیکن غالب کے

مشورہ کے بعد ناظم تخلص اختیار کیا[۵۳]۔ان کی شاگردی کا یہ سلسلہ ۱۸۵۵ء سے شروع ہوا۔ جیسا کہ غلام غوث بے خبر کو تحریر کیا ہے کہ سنہ ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کے میرے آشنای قدیم ہیں۔اس سال یعنی سنہ ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ اسی خط میں آگے لکھتے ہیں کہ جب میری دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیے پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں غدر کرتا تھا۔ آخر جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور آ گیا[۵۴]۔

جن اصحاب کا خیال یہ ہے کہ کلام ناظم دراصل کلام غالب ہے۔ان میں سید ہاشمی فرید آبادی (رسالہ الناظر) شیخ محمد اکرام (غالب نامہ) اور (نقدِ غالب) وغیرہ شامل ہیں۔ان خیالات کی تردید میں اکبر علی خاں نے غالب کا ایک نودریافت خط پیش کیا ہے۔

''شہریار کا حال یہ ہے کہ سچ عرض کرتا ہوں نواب صاحب کو پروردگار نے جیسا حسنِ تناسبِ اعضا و اندام دیا ہے۔ ویسا ہی حسن تخیل و اعجازِ کلام دیا ہے۔چند روز ہوئے بیاض مردف کے اوراق برائے اصلاح مرحمت فرمائے۔اس سحر حلال کو کوئی کیا ہات لگائے۔خدا کی قسم مجھے اس شخص کے حسنِ صورت پر رشک آتا ہے۔اگر اپنے تئیں اس کا ہم عصر پاتا۔ بھلا شیریں کلامی پر کیوں رشک آئے۔ دعا گو کہتا ہے کہ خدا اسے نظر بد سے بچائے۔ میں نے تو حضور سے صاف عرض کر دیا کہ ان اشعار کے پردے میں ولی نعمت نے معانی کی پریوں کو بند کیا ہے۔فقیر نے حسب ارشاد خداوند نقطہ ہائے اصلاحی کو ان کی رفع نظر بد کے لیے دانہ ہائے سپند کیا ہے۔سن کے گلے سے لگا لیا۔اور فرمانے لگے کہ مرزا صاحب کے نقوشِ قدم پر قدم رکھنے کی بے ادبی

ہوئی ہے تو معاف فرمایئے۔ مگر اس میں ہماری عقیدت کو دخل
ہے۔ اس جسارت پر ہنسی نہ اڑایئے۔ عرض ہوا تھا کہ میرے
معروضات میں مبالغے کا شائبہ بھی نہیں۔

اور سنو تعجب کرو گے کہ فرزند دل پذیر بھی نواب صاحب کے
اخلاق پسندیدہ اور اوصافِ حمیدہ کا مالک ملا ہے۔ خوش گفتار،
صاحب گفتار، صاحب کردار۔

غرض کئی دن سے یہ اوراقِ غزلیات پڑھ رہا ہوں کہیں کہیں
غلطی املا ہے۔ اور بس اغلاط کو بنا تا اور کاتبِ ناہنجار کو بزبانِ قلم
بتا تا چلتا ہوں۔ واسطے تمھارے دو غزلیں ارمغان بھیجتا ہوں۔
انصاف سے کام لو۔ کہاں قلم لگاؤں۔ ضد کی اور بات، کیا یہی
کہے جاؤ گے تو نے مصطفےٰ خاں سے خوامخواہ بڑھا دیا[۵۵]۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ درست ہے کہ نواب کلب علی خاں تلامذۂ غالب میں شامل نہیں
ہو سکے۔ انہوں نے مرزا غالب سے فارسی نثر میں اصلاح ضرور لی تھی۔ مگر اختلاف رائے
کے باعث وہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور صرف وظیفہ جاری رہ گیا[۵۶]۔

منشی سیل چند افسر دارالانشا ریاست رامپور نے نواب یوسف علی خاں ناظم کے
غسلِ صحت پر جو تاریخ کہی اس پر مشورہ کیا لیکن بقول مالک رام محض ایک قطعہ پر مشورہ
کرنے سے انہیں باقاعدہ شاگرد نہیں کہا جا سکتا[۵۷]۔

نواب کلب علی خاں کے ماموں عباس علی خاں بے تاب نواب یوسف علی خاں کی
طرح پہلے مومن کے شاگرد تھے۔ اور بعد میں غالب سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ان کے کلام
پر بھی غالب کی اصلاحیں موجود ہیں۔

نادر شاہ شوخی نے غالب کی تشریف آوری پر بغرض اصلاح اپنا کلام پیش کیا تو

انہوں نے عذر کیا کہ میں نواب صاحب کا ملازم ہوں بغیر اجازت اصلاح نہیں دے سکتا۔
شوخی نے انہیں شراب پیش کی اور اصلاح کا سلسلہ شروع ہو گیا[۵۸]۔

ان کے علاوہ حکیم مظہر احسن خاں مظہر، حکیم فتح یاب خاں اخگر، عبدالوہاب خاں سرخوش، شہاب الدین خاں شہاب، خان محمد خاں شہیر، فدا علی خاں فدا، عبداللہ خاں محشر، افتخار الدین معلوب فخر الدین، نادم کو بھی غالب کا رامپوری شاگرد تسلیم کیا گیا ہے[۵۹]۔

لیکن محققین کا ایک ایسا حلقہ بھی ہے جو نظام رام پوری کو بھی تلامذۂ غالب میں شامل کرتا ہے۔ سب سے پہلے یہ کارِ خیر خواجہ عبدالرؤف عشرت بریلوی نے ''آب بقا'' میں اور شبیر علی خاں شکیب نے اپنی تصنیف ''رامپور کا دبستانِ شاعری'' میں انجام دیا۔ مگر اسے کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ کلب علی خاں فائق نے ''کلیاتِ نظام'' مطبوعہ لاہور میں اور مالک رام نے ''تلامذۂ غالب'' میں ان کی شاگردی کا ابطال کیا ہے[۶۰]۔

اس دعوی کے برعکس عتیق الرحمٰن خاں کلیم نے ۱۹۴۰ء میں ''تذکرۂ کلیم'' (مخطوطہ رضا لائبریری) میں اپنے بزرگوں کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ:

> ''ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ مرزا نوشہ غالب رامپور آئے۔ نظام کا کلام سنا تو فرمایا کہ: ''رامپور میں بھی ایسے دماغ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تو رامپور کے میر ہیں[۶۱]۔

اس طرح غالب سے نہ صرف والیانِ ریاست کے تعلقات وروابط رہے بلکہ اہالیانِ شہر بھی ان سے بے حد مانوس تھے۔ اتفاق سے مرزا غالب کو رامپور میں قیام کرنے کا بہت کم موقع ملا۔ مگر جتنے عرصہ بھی وہ یہاں رہے وہ اُردو ادب کی تاریخ میں ایک نا قابلِ فراموش واقعہ ہے اور اس پر رام پور والے بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

۱۔ حق جاگیر غالب از پرتھوری چندر، تعارف، ص ۶ (مطبوعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی) بالتفات نیشنل آرکیوز حکومت ہند، نئی دہلی

۲۔مکاتیب غالب نسخۂ عرشی ناظم پریس رامپور، ۱۹۴۷ء، ص ۱۷
۳۔یادگارِ غالب از مولانا الطاف حسین حالی۔
۴۔(الف) غالب کے لطیفے مرتبہ انتظام اللہ شہابی، ص ۱۲
(ب) غالب کی فارسی شاعری از وارث کرمانی۔
۵۔کلیاتِ نظام مرتبہ ذکیہ جیلانی مطبوعہ ۱۹۸۵ء ص ۵۶۴ (تحقیقی مقالہ)
۶۔راز یزدانی، مضمون ''رام پور کا ماحول شعر و سخن'' مشمولہ ''نگار''
۷۔مکاتیب غالب نسخۂ عرشی اور غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم
۸۔مکاتیب غالب نسخۂ عرشی مطبوعہ ۱۹۴۵ ناظم پریس رام پور دیباچہ ص ۷۶
۹۔بحوالہ کلیاتِ ناظم مرتبہ ذکیہ جیلانی صفحہ ۳۹، مطبوعہ ۱۹۸۵ء (تحقیقی مقالہ)
۱۰۔مکاتیب غالب دیباچہ صفحہ ۸۱
۱۱۔(نقش آزاد) (الف) از مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ لاہور مرتبہ غلام رسول مہر ۱۹۵۸ء، ص ۲۹۳
۱۲۔(ب) نقش آزاد، از آزاد مرتبہ غلام رول مہر بطوطہ لاہور صفحات ۳۶۰
۱۳۔مکاتیب غالب دیباچہ حاشیہ ص ۸۰
۱۴۔عتیق صدیقی۔غالب اور ابوالکلام۔مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء
۱۵۔مکاتیب غالب، نسخۂ عرشہ، دیباچہ ص ۹۵
۱۶۔(الف) مکاتیب غالب نسخۂ عرشی مطبوعہ ناظم پریس ۱۹۴۷ء
(ب) غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم جلد اول غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، مطبوعہ ۱۹۸۴ء، ص ۳۱۸
۱۷۔مرتبہ۔امتیاز علی خاں عرشی مضمون۔''میرزا غالب کی اصلاحیں ناظم و بیتاب کے کلام پر'' آف پرنٹ نگار لکھنؤ اکتوبر ۱۹۴۳ء
۱۸۔رامپور کا جشن بہار مطبوعہ ۱۹۷۰ء رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ص ۵۵۔
۱۹۔''غالب کی قیام گاہ۔رام پور کی یادگار تقریب'' (امتیاز علی عرشی) مطبوعہ ۱۹۴۴ء ص ۴۲
۲۰۔مکاتیب غالب، نسخۂ عرشی دیباچہ صفحہ ۹۵
۲۱۔ایضاً، دیباچہ ص ۱۰۰
۲۲۔ایضاً، ایضاً، ص ۱۰۶
۲۳۔(الف) ایضاً، ایضاً، ص ۱۰۶ (ب) خطوط غالب اول بنامِ تفتہ مرتبہ خلیق انجم، ص ۳۲۱
۲۴۔مکاتیب غالب، نسخۂ عرشی دیباچہ، ص ۱۰۶
۲۵۔ایضاً، ص ۱۰۷
۲۶۔ایضاً، ص ۹۹
۲۷۔مکاتیب غالب، دیباچہ ص ۹۹

۲۸۔ایضاً،ص ۹۹
۲۹۔دیوانِ غالب نسخہ عرشی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور،۱۹۹۲ء،ص ۲۴،۲۵
۳۰۔ایضاً،ص ۲۹
۳۱۔بحوالہ دیوان غالب، نسخہ عرشی مطبوعہ لاہور ۱۹۹۲ء،ص ۱۰۴،۱۰۵
۳۲۔ایضاً، دیباچہ،ص ۴۴
۳۳۔دیوان غالب، نسخہ عرشی لاہور ایڈیشن،۱۹۹۲ء،ص ۱۰۴،۱۰۵
۳۴۔مکاتیب غالب، مطبوعہ ۱۹۴۵ء، دیباچہ،ص ۴۴
۳۵۔دیباچہ،ص ۱۱۳
۳۶۔ایضاً، دیباچہ،ص ۱۱۹/۱۲۰
۳۷۔مکاتیب غالب، دیباچہ،ص ۱۱۸
۳۸۔ایضاً،ص ۱۲۱
۳۹۔ایضاً،ص ۱۲۰
۴۰۔ایضاً،ص ۱۲۳
۴۱۔یادگارِ غالب از مولانا حالی، صفحہ ۴۲
۴۲۔(الف) مکاتیب غالب نسخہ عرشی دیباچہ،ص ۱۱۸
(ب) خطوطِ غالب، مرتبہ خلیق انجم، دوم ص ۶۳۵
۴۳۔مکاتیب غالب دیباچہ،ص ۱۲۰
۴۴۔مکاتیب غالب نسخہ عرشی دیباچہ ۱۲۵
۴۵۔اخبار الصنادید حکیم نجم الغنی خاں جلد دوم مطبوعہ رضا لائبریری ۱۹۹۷ صفحہ ۱۴۰
۴۶۔دیوان غالب نسخہ عرشی مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۹۲، مقدمہ صفحہ ۵۵
۴۷۔ایضاً، مقدمہ ص ۵۵
۴۸۔رامپور کا جشنِ بہار مطبوعہ رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ۱۹۷۰ء کل صفحات ۱۳۶
۴۹۔دیوان غالب حاشیہ ص ۳۸۱
۵۰۔نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی حدمات (تحقیقی مقالہ) مرتبہ ڈاکٹر شمس بدایونی
(ب) دیوانِ غالب نسخہ عرشی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۹۲ء۔
۵۱۔دیوان غالب، مطبوعہ لاہور،ص ۲۹
۵۲۔ایضاً،ص ۳۰
۵۳۔دیوان غالب نسخہ عرشی،ص ۲۹
۵۴۔ایضاً،ص ۳۰

۵۵۔(الف) رامپور کا جشن بہار مطبوعہ ۱۹۷۰ رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ص ۵۴، ۵۵
(ب) مجلہ صحیفہ لاہور غالب نمبر حصہ سوم

۵۶۔(الف) مالک رام (تلامذۂ غالب) مطبوعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۴ء، دیباچہ ص ۱۶ سطر ۶

۵۷۔ایضاً ص ۱۶

۵۸۔مکاتیب غالب، نسخہ عرشی

۵۹۔تلامذۂ غالب از مالک رام

۶۰۔دیکھیے کلیاتِ نظام مرتبہ کلب علی خاں فائق مطبوعہ لاہور

۶۱۔نظام رامپوری مرتبہ شعائر اللہ خاں، صفحہ ۱۱۳

سید لطیف حسین ادیب

غالب کے رامپوری دوست
مرزا عبدالقادر غمگین

نام عبدالقادر ولد محمد کرم آشنا ولد مرزا احمد محدث ولد مرزا محمد اسحاق برلاس۔ رامپور میں پیدا ہوئے[۱]۔ ان کی تاریخ پیدائش کا راست حوالہ نہیں ملتا۔ امیر مینائی نے اُن کی تاریخِ وفات ۷/ رجب ۱۲۶۵ ہجری درج کرتے وقت عمر ۶۵ سال تحریر کی تھی[۲] جس کے مطابق ان کی تاریخِ پیدائش ۱۲۰۰ ہجری ہونی چاہیے۔

ان کے پرداوا مرزا محمد اسحاق برلاس تھے۔ ان کے نبیرہ مرزا نصیرالدین علیل مرادابادی (م ۱۹۰۹ء) ابن مرزا عبدالہادی خاں نے اپنی خود نوشت سوانحِ حیات ''نگینۂ انگشتریٔ سلیمانی'' میں اپنے نام کے ساتھ برلاس کا اضافہ کیا ہے[۳]۔ لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا تعلق ایک ترکوں کے قبیلۂ برلاس سے تھا۔

ان کے علم وفضل کا اعتراف ان کے ہمعصر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ نصراللہ خاں خویشگی نے ان کو ''عالمِ علومِ عقلیہ۔ واقفِ فنونِ نقلیہ'' بتایا[۴]۔ عبدالغفور نساخ نے تحریر

کیا کہ وہ ''فاضل بے بدل'' تھے[۵]۔ مرزا قادر بخش صابر نے لکھا کہ انہوں نے تمام علوم متداولہ مفتی شرف الدین سے حاصل کیے[۶]۔ امیر مینائی نے مطلع کیا کہ ''چوں برس کی سن میں تحصیل کتبِ درسیہ سے فارغ ہو کر دستارِ فضیلت زیبِ سر کی''[۷]۔

حافظ احمد علی شوق رامپوری نے اُن کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا کہ ''علماے مراداباد اور رامپور سے علوم فنونِ فارسی وغزلی پڑھے۔ رامپور میں مفتی شرف الدین اور مولانا منیر علی سے کتابیں پڑھیں۔ سنا ہے چودہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے[۸]۔

مرزا عبد القادر غمگین کی ملازمت کے سلسلے میں تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ وہ مراد آباد میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز وممتاز تھے۔ امیر مینائی نے مزید اطلاع دی کہ انہوں نے سرکارِ انگلشیہ میں عمدہ عمدہ نوکریاں پائیں اور مقتدر رہے تاہم امیر مینائی نے صدر الصدور کے علاوہ کسی اور سرکاری ملازمت کا نام نہیں لکھا۔ اس سلسلے میں حافظ احمد علی شوق رامپوری نے عبد القادر رامپوری کی ملازمت کی تفصیل اس طور پر پیش کی ہے:

> ''۱۸۰۹ء میں ضلع مراد باد میں سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ اجمیر، راجستھان جبلپور، ناگپور میں بڑے بڑے عہدوں پر ملازم رہے۔ لارڈ ولیم بینٹک[۱۰] نے مراد باد میں صدر الصدور کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے محلہ بھٹی مراد باد میں سکونت اختیار کی۔ سرکار کمپنی نے خطاب خان بہادر اور خلعت دیا۔ ۱۸۳۸ء میں ملازمت ترک کر کے دہلی گئے۔ دہلی میں شاہ ظفر کے پاس چھ مہینے رہے۔ دہلی سے پھر مراداباد آ گئے۔ اس دوران میں جناب محمد سعید خاں بہادر جنت آرام گاہ نے مسند نشین[۱۱] ہو کر طلب فرمایا۔ عدالتِ دیوانی وفوجداری پر مفتی مقرر فرمایا۔ اُس کے بعد مدرسۂ عالیہ کی نگرانی اور حاکمِ مرافعہ کی

خدمات سپرد کیں[۹]"۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری جنہوں نے عبدالقادر غمگین کے روزنامچہ اور ان کے نبیرہ مرزا نصیرالدین برلاس علیل مرادبادی (م ۱۹۰۹ء) کی خودنوشت "نگینۂ انگشتریِ سلیمانی[۱۰]" کا فارسی سے اردو ترجمے کر کے مع حواشی علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) کے نام سے ۶۱-۱۹۶۰ء میں شائع کرایا تھا، ان کی ملازمت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل معلومات فراہم کی ہیں:

۱۸۱۴ء میں بہ سلسلۂ ملازمت دہلی پہنچے

۱۸۱۵ء میں واپس آ گئے۔

۱۸۱۷ء میں دوبارا گئے۔

۱۸۱۸ء میں تبادلہ اجمیر ہو گیا۔

۱۸۲۵ء میں رخصت لے کر رامپور آ گئے۔

۱۸۳۱ء میں اپنا روزنامچہ مرتب کیا۔

۱۸۴۰ء میں شاہ ظفر کے وکیلِ مطلق مقرر ہوئے[۱۱]۔

اس تفصیل سے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ عبدالقادر غمگین، صدرالصدوری کے عہدے پر فائز ہونے سے پہلے، سرکار کمپنی میں کسی عہدے پر ملازم ہوئے تھے۔ لارڈ ولیم بینٹک ۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۵ء تک ہندوستان کا گورنر جنرل رہا۔ عبدالقادر غمگین نے اپنا روزنامچہ ۱۸۳۱ء میں تلمیذ کیا جب کہ وہ رامپور واپس آ گئے تھے۔ لہٰذا اُن کی صدرالصدوری کے عہدے پر فائز ہونے کی تاریخ ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۵ء کے مابین ہوگی۔ بعد کو انہوں نے ۱۸۳۸ء میں صدر اصدوری سے استعفاء دے دیا تھا۔

عبدالقادر غمگین کی وفات ۱۸۴۹ء کو بزمانہ نواب محمد سعید خاں ہوئی تھی۔ شاید وفات کے وقت اُن کا ریاست رامپور میں سلسلۂ ملازمت جاری تھا۔

نصر اللہ خاں خویشگی نے عبدالقادر غمگین کے ترک منصب سرکاری کا سبب ان کے مزاج کی وارستگی کو قرار دیا تھا[15]۔ خویشگی نے اپنا تذکرہ ۱۸۴۱ء میں تحریر کیا تھا۔ چودہ سال بعد ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء میں مرزا قادر بخش صابر نے ترکِ ملازمت کا سبب بتاتے ہوئے تحریر کیا کہ ان کو حاکم بالا دست کی ناقدردانی سے خاطرِ نازک کو گرانی پہنچی اور انہوں نے سلسلۂ ملازمت منقطع کر کے کُنجِ عزلت میں انزوا اختیار کیا[16]۔

اِس وقت یہ بات قابل غور ہے کہ عبدالقادر غمگین خطّۂ توران کے قبیلۂ ایک کے بَرلاس ترک تھے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے تاشقند اور سمرقند میں قیام کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کیا کہ ایک ترکوں کے قبیلۂ برلاس میں لڑائی ہے تو سالہا سال اور دوستی ہے تو اپنی کھال کی جوتیاں بنا دیں گے۔ کبھی عزت کا سودا نہیں کرینگے[17]۔ غالب کی مثال سامنے ہے جو تورانی اور ایک ترک تھے۔ غالب نے اودھ کے نائب السلطنت آغا میر سے ملاقات اس لئے نہیں کی کہ وہ کھڑے ہوکر ان کی پذیرائی کے لئے تیّار نہیں ہوا[18]۔ اور انہوں نے دلّی کالج کی مدرّسی اس وجہ سے قبول نہیں کی کہ پرنسپل اُن کے استقبال کے لیے نہیں آیا تھا[19]۔ غالب توقیر میں کمی کو ننگ خیال کرتے تھے۔ یہی ذہنی کیفیت عبدالقادر غمگین کی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے حاکمِ بالا دست کی ناقدردانی سے دل برداشتہ ہوکر ملازمت ترک کر دی لیکن عزّت کا سودا نہیں کیا۔

غالب نے جب کلکتہ میں مثنوی بادِ مخالف[20] لکھی تو اس کی ایک نقل عبدالقادر رامپوری کو بھی بھیجی تھی جس سے بقول ایوب قادری کے ''معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی نظر میں مولوی عبدالقادر رامپوری کا بڑا مقام تھا[21]۔''

عبدالقادر غمگین کے روزنامچے (۱۸۳۱ء) میں غالب کا ذکر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی غالب سے بالمشافہ ملاقات ۱۸۴۰ء میں ہوئی جب کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں وکیلِ مطلق مقرر ہوئے تھے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری رقمطراز ہیں:

بہادر شاہ ظفر کے دربار میں مولوی عبدالقادر تقریباً ۱۲۵۷ھ میں
وکیلِ مطلق مقرر ہوئے۔ اُسی زمانے میں اکابر و عمائد دہلی سے
اُن کے تعلقات ہوئے اور علمی و ادبی اور شعری و تہذیبی حلقوں
میں باریاب ہوئے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مرزا غالب
سے بھی تعلقات ہوئے[۲۴]۔"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور مرزا غالب سے ۱۸۴۰ء سے قبل ملاقات نہ ہونے کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ شیفتہ نے تذکرۂ گلشنِ بے خار (۱۲۵۰ھ/ ۳۵۔۱۸۳۴ء) میں عبدالقادر غمگین کا ترجمہ شامل نہیں کیا ہے۔

مرزا عبدالقادر غمگین رامپوری کا جتنا بھی کلام تذکرات میں ملتا ہے، وہ مشکل پسندی سے کوسوں دور ہے۔ اپنے اس اُسلوب کی وجہ سے ان کی طبع غالب کی مشکل پسندی کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ انہوں نے غالب کے ادق اشعار پر کھُل کر تو اعتراض نہیں کیا لیکن ظرافت کے پیرائے میں یہ بات باور کرائی کہ اُن کے دیوان میں بعید از فہم مشکل اشعار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا حالی نے تحریر کیا ہے:

"ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے، جن کو چند روز قبل دہلی سے تعلق رہا تھا، مرزا غالب سے کسی موقع پر کہا کہ آپ کا ایک شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اُس وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھ دیے۔

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گُل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سخت حیران ہوئے اور کہا ماشا یہ میرا شعر نہیں ہے۔ مولوی عبدالقادر نے از راہ مزاح کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں

دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔ آخر مرزا کو
معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا
یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے
ہیں [۲۳]۔"

بقول ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے حالی اس قسم کے واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان نکتہ چینوں اور تعریفوں سے مرزا غالب متنبہ ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہِ راست پر آ گئی [۲۴]۔"

حالیؔ کی یہ رائے صحیح ہو سکتی ہے۔ تاہم اس واقعے سے مولوی عبدالقادر رامپوری غالب سے تعلق کے حوالے سے بہت مشہور ہو گئے۔ مولوی عبدالقادر شاعر تھے۔ غمگینؔ تخلص تھا۔ عبدالغفور نساخ نے اطلاع دی کہ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا قادر تخلص لکھا ہے [۲۵]۔ نصر اللہ خاں خویشگی نے ان کا تخلص غمی تحریر کیا ہے [۲۶]۔ امیر مینائی کے بقول اُن کا کلیات [۲۷] گم ہو گیا جس کے بدون تخلص کی تحقیق ممکن نہیں۔ البتہ امیرؔ مینائی نے اشعار نقل کرتے وقت ایک مطلع بھی نقل کیا جو مندرجہ ذیل ہے:

پَر اوس بُت کے نزدک کیا جائے غمگیں
ہوا کُفر ثابت کہ ایمان ٹھہرا

ایسی صورت میں اُن کے تخلص غمگین کو ہی ترجیح دی جا سکتی ہے جس سے وہ مشہور بھی ہیں۔

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ عبدالقادر غمگین نے کس استاذ سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ کسی بھی تذکرے میں اُن کے استاذ کا نام نہیں ملتا۔

عبدالقادر غمگین کی شاعری کے متعلق عبدالغفور نساخ نے لکھا کہ وہ گاہ گاہ فکر شعر کرتے تھے [۲۹]۔ امیر مینائی نے اطلاع دی "کہتے ہیں کہ عربی، فارسی، اردو بھاکا مرہٹی سب زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے اُن کے کمالِ شاعری کے رتبہ شناسی پر

ملال کیا ہے [۲۱]۔

عبدالقادر غمگین کے اشعار تذکرات میں محفوظ ہیں جن کو اس موقع پر نقل کر دیا گیا ہے۔ ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالقادر غمگین مشکل پسندی کے قائل نہیں تھے۔ ان کو تلاشِ مضمون کا شوق ضرور تھا لیکن مضمون کو سلاست و سادگی سے ادا کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں عشقیہ شاعری کا تلازم بھی ہے جو شعرائے رامپور پر اساتذۂ لکھنؤ کے بڑھتے ہوئے اثرات کا غماز ہے۔

حافظ احمد علی شوقؔ رامپوری (م ۱۹۳۳) نے ان کے ایک پند نامۂ فارسی کی نشاندہی کی ہے اور اس کے تین اشعار نقل کیے ہیں [۲۲]۔ مولوی عبدالقادر غمگینؔ عام طور پر عبدالقادر چیف کے نام سے مشہور تھے۔ رجب کی ساتویں تاریخ ۱۲۶۵ ہجری کو رامپور میں انتقال کیا اور مولانا جمال الدینؒ کے مقبرے میں دروازے کے پاس بیریوں کے نیچے دفن ہوئے۔ مرزا عبدالہادی خاں اور مرزا عبدالقیوم خاں دولڑکے یادگار چھوڑے [۲۳]۔

نمونۂ کلام:

تیرے دیوانے کے کوئی پئے آزار ہے کیا ۔۔۔ دیکھ تو شور ابر پام سا پس دیوار ہے کیا
میں کہا قتل مجھے کر تو غموں سے چھوٹوں ۔۔۔ بولا اس لطف و کرم کے تو سزاوار ہے کیا
میں نے پوچھا کہ اِن ایام میں ملتا ہے کم ۔۔۔ کچھ خفا مجھ سے تو اب اِن دنوں اے یار ہے کیا
بولا رنجش تو وہاں ہو کہ جہاں ہو کچھ ربط ۔۔۔ میری اور تیری بھلا دوستی او رپیار ہے کیا

میں خراباتی و بے باک ہوں اور لوگ مجھے ۔۔۔ پارسا سمجھے ہیں، اللہ تری ستاری

تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار، ص ۴۰۔ ۲۳۹

جو رہے نہ تو شیشہ جھکا کے ساقی لے　　کہا یہ رندوں سے لیجے سلام شیشے کا
بندے کو طلب ہوئے تو سرکار میں آوے　　خلوت میں نہ ہو حکم تو دربار میں آوے

تذکرۂ سخن شعرا، ص ۳۵۴

تخمس بر غزل حافظ شیرازی:

خدمت میں ساری فراموش شکایت کی یاد　　شُبہ میں ایک خطا کے ہمہ نیکی برباد
بندگی صاحب من خانۂ نیکی آباد　　گر نہاد ست ہمہ اینست زہے نیک نہاد

در سرشت ہمہ اینت زہے نیک سرشت

مہ کر نہ سکا سامنے مُنھ اوس کے تو ہرگز　اب ہم سے ہوا چاہے ہے گھٹ گھٹ کے برابر
عادت سے اپنے ہاتھوں کی ہم کو نہیں امید　لپٹے رہیں ساز تلک بھی کفن میں ہم

تذکرۂ گلستان سخن، ص ۸۱ ـ ۳۸۰

کیوں نہ کریں پیری میں سیر جہاں کی　　دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا
حرم میں برہمن رکھا نام مرا　　گیا دیر میں تو مسلمان ٹھہرا
پر اوس بُت کے نزدیک کیا جائے غمگین　　ہوا کفر ثابت کہ ایمان ٹھہرا
یہ ہے قسمت کی خوبی دیکھا سے میرے جنازے پر　　نمازی یہاں تلک بہکے کہ ایک تکبیر کم کردی
کس کی چتون نے مجھے مارا ہے　　اپنی آنکھوں کا جرم سارا ہے
جام اور کفِ دست تو نشت دگر است　　یہ بیفادگر و دست تو دست وگر است
زندہ در گور شدن بہ زتنِ خستۂ خویش　　بار با گردنِ یارانِ جہاں نگذارم

تذکرۂ انتخاب یادگار، ص ۲۷۲

پند نامہ فارسی:

شکم شیر کن باد بہ نان جویں   پئے پوششِ تن گلیمے گزیں
بہ گرما و سرما بہ زیرِ درخت   بسر کن کہ نے مایہ داری نہ رخت
چہ حاصل زر و سیم داری بہ گنج   چو باشی زبے آبروئے بہ رنج

تذکرۂ کاملان رامپور، ۲۳۵ص

حواشی:

۱۔تذکرۂ کاملان رامپور، ص۲۳۴
۲۔انتخاب یادگار، ص۲۷۱
۳۔غالب اور عصر غالب، ص۱۸۴
۴۔گلشن ہمیشہ بہار، ص۲۳۹
۵۔سخن شعرا، ص۳۵۳
۶۔گلستان سخن، ص۳۸۰
۷۔انتخاب یادگار، ص۲۷۱
۸۔تذکرۂ کاملان رامپور، ص۲۳۴
۹۔انتخاب یادگار، ص۲۷۱
۱۰۔گورنر جنرل ہندوستان، ۱۸۲۸ تا ۱۸۳۵ء۔ دراصل محلہ بھٹی مراد آباد میں سکونت کا باعث یہ تھا کہ اُس محلے میں مولوی عبدالقادر کی شادی ہوئی تھی۔
۱۱۔زمانہ حکومت ۲۱ جمادی الآخر ۱۲۵۶ھ تا ۱۳ر رجب ۱۲۷۱ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۴۰ تا یکم اپریل ۱۸۵۵ء
۱۲۔تذکرۂ کاملان رامپور، ص۲۳۴۔۲۳۵
۱۳۔یہ تاریخی نام ہے۔ جس سے ۱۳۱۷ ہجری (مطابق ۱۸۹۹ء۔۱۹۰۰) کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔
۱۴۔غالب اور عصر غالب، ص۱۸۹
۱۵۔گلشن سخن۔ص ۳۸۰
۱۷۔رک ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا مضمون ''غالب کی شخصیت اور شاعری میں ترکی عناصر''۔ مشمولہ غالب نمبر اسلامیہ کالج میگزین بریلی۔۷۰۔۱۹۶۹ء۔ مدیر شکیل احمد صدیقی، ص۴۱
۱۸۔ذکر غالب، ص۴۲
۱۹۔ذکر غالب، ص۶۰
۲۰۔غالب اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے تھے اور ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس

آئے۔ انہوں نے مرزا قتیل کے معرفین و تلامذے سے ادبی معرکے کے بعد برائے رفع شر مثنوی باد مخالف (۱۸۲۸ء) تحریر کی تھی۔ رک ذکر غالب ص ۴۶ تا ۴۸۔

۲۱۔ غالب اور عصر غالب، ص ۱۸۸۔ ایوب قادری نے خط کا حوالہ نہیں دیا۔ دراصل یہ خط چودھری عبدالغفور سرور کا تھا جس میں انہوں نے غالب سے مصرع۔ ماشاءاللہ بدنمیگویم۔ کے متعلق استفسار کیا تھا۔ غالب نے جواباً تحریر کیا کہ یہ مصرعہ مثنوی باد مخالف کا ہے جو انہوں نے کلکتہ میں لکھی تھی اور جس کی ایک نقل عبدالقادر رامپوری کو بھی بھیجی تھی۔ رک عود ہندی۔ ص ۲۱۔

۲۲۔ غالب اور عصر غالب، ص ۱۸۷۔

۲۳۔ یادگار غالب، ص ۱۱۲۔

۲۴۔ غالب اور عصر غالب، ص ۱۸۸۔

۲۵۔ سخن شعرا، ص ۳۵۳۔

۲۶۔ گلشن ہمیشہ بہار، ص ۲۳۹۔

۲۷۔ انتخاب یادگار، ص ۲۷۱۔

۲۸۔ انتخاب یادگار، ص ۲۷۱۔

۲۹۔ سخن شعراء، ص ۳۵۳۔

۳۰۔ انتخاب یادگار، ص ۲۷۱۔

۳۱۔ گلستان سخن، ص ۳۸۰۔

۳۲۔ تذکرۂ کاملان رامپور، ص ۲۳۵۔

۳۳۔ تذکرۂ کاملان رامپور، ص ۲۳۵۔ حضرت مولنا سید جمال الدینؒ مصور توحید لاہوری ثم رامپوری (م ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۶ء) کا مزار اندرون باغ سرکاری قدیم بریلی دروازہ رامپور میں ہے۔ آپ کا سلسلۂ طریقت چشتیہ نظامیہ فجریہ ہے۔ رک آئینۂ دلدار۔ ص ۲۲۱۔

کتابیات:

امیر مینائی، امیر احمد۔ انتخاب یادگار۔ اُتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۸۲ء
ابرار علی، محمد، صدیقی، آئینۂ دلدار، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۶ء
حالی، الطاف حسین، پانی پتی، یادگار غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء
خویشگی، نصر اللہ خاں، گلشن ہمیشہ بہار، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۷ء
سرور، عبدالغفور، چودھری، عود ہندی (۱۸۶۸ء)۔ رام کمار بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۰ء
شوق، احمد علی خاں، حافظ، رامپوری، تذکرۂ کاملان رامپور، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۶ء
صابر، قادر بخش، شہزادہ، مرزا، دہلوی، گلستان سخن، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۸۲ء

محمد ایوب قادری، ڈاکٹر، غالب اور عصر غالب، غضنفر اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۲ء
مالک رام، ذکر غالب، جامعہ مکتبہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۵۰ء
نساخ، عبدالغفور، سخن شعرا، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۸۲ء

مضمون ''غالب کی شخصیت اور شاعری میں ترکی ایرانی عناصر'' ۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، مشمولہ اسلامیہ کالج بریلی میگزین غالب نمبر، ۱۹۶۹ء ۔ ۱۹۷۰ء ۔ مدیر محمد شکیل صدیقی

ابنِ فرید

رامپور میں اردو کا فروغ

ریاست کی حیثیت سے رامپور کی تاریخ بہت مختصر ہے، لیکن روہیلوں کی آبادی یہاں اس سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ انہیں افاغنہ کہا جاتا تھا، لیکن زمانۂ قبلِ اسلام سے یہ ''پاہان'' کہلاتے تھے جو امتدادِ زمانہ سے ''پٹھان'' کہلائے جانے لگے۔ ''پاہان'' ان کے بودھ پیش رووں کی لغات میں سے ایک لفظ تھا جو تفاخر کے لیے استعمال ہوتا تھا جس کا بتیانِ شخصیت (Declaration of Personality) لفظ ''پٹھان'' سے بھی ہوتا ہے۔

پٹھان ہندوستان سپہ گری کے لئے آتے رہے ہیں، خاص طور سے مسلم سلاطین انہیں اپنی عسکری طاقت میں اضافہ کے طور پر مدعو کرتے رہے ہیں۔ ترک اور غلام سلاطین کے زمانہ سے ہر سلطان کی کوشش یہ رہی کہ کسی صورت سے شیوخِ اودھ کے گڑھ کو مسمار کیا جائے اور اس زرخیز ترین علاقہ کو سرنگیں کیا جائے، لیکن اس میں مغلوں کے عہد تک کامیابی نہ ہو سکی، یہاں تک کہ خود شیوخِ اودھ میں پروان چڑھنے والی ریشہ دوانیوں نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا اور اورنگ زیب کے عہد میں پنچ محل کے پھاٹک کی محراب سے لٹکتی ہوئی

تلوار کٹ کر زمین پر آ گری۔ یہ صدیوں کا عمل تھا جس کے دوران افغانستان سے جرگوں پر جرگے آتے رہے اور اودھ کے مغرب میں خیمہ زن ہوتے رہے۔ جیسے جیسے شیوخِ اودھ کمزور ہوتے گئے روہیلوں کی بستیاں مشرق کی طرف بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ خود لکھنؤ کے جوار میں ملیح آباد بس گیا۔ اس طرح ایک بڑے علاقہ میں روہیلے پھیل گئے۔

ہندوستان منتقل ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی تہذیبی، معاشرتی و ثقافتی شناختوں کو قائم و باقی رکھا۔ مثلاً، پوشاک، غذا، شعائرِ دینی اور جرگہ کی زندگی، گھیر اور محلّوں کے نام جرگوں کے نام اور ان سے مختص مساجد، کھیت، قبرستان، وغیرہ کی نسبت جرگوں سے۔ آبادی بڑھنے کے ساتھ ایسے بہت سے امتیازات مٹتے گئے، لیکن کچھ آثار اب بھی باقی ہیں۔ ان کے بہ نظرِ غائر مطالعہ سے پٹھانوں کی قبائلی زندگی کی تصویر بڑی حد تک نمایاں ہوکر سامنے آتی ہے۔ اسی تصویر میں بعض توجہ طلب خطوط نمایاں ہوتے ہیں۔

روہیلوں نے اپنے بہت سے تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی آثار زندہ باقی رکھے، لیکن زبان کے معاملہ میں وہ ایسا نہ کر سکے۔ مغربی یوپی اور اودھ کے کچھ حصہ پر اکثریت میں آباد ہونے کے باوجود وہ اپنی زبان کو ترک کرنے اور اجنبی زبان کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کیوں؟ مغلوں کے آخری دَور تک جواُن کے زوال و انتشار کا دور تھا درباری زبان فارسی رہی ہے، لیکن عام بول چال کی زبان اردو بن چکی تھی، اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں یہ شعر و ادب کی بھی زبان بن گئی تھی۔ انیسویں صدی میں اسے مزید اعتبار حاصل ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے سرکاری زبان بنا دیا۔ لیکن اب بھی جن تحریروں کو زیادہ وقار کا مرتبہ عطا ہوتا تھا وہ فارسی ہی میں لکھی جاتی تھیں۔

تمام چھوٹے بڑے رجواڑے اور نوابیاں دلی ہی کی طرف اپنا رخ رکھتی تھیں کیوں کہ ٹوٹی پھوٹی شہنشاہیت کا کچھ نہ کچھ بھرم اب بھی باقی تھا۔ جب دربارِ دلی اجڑ گیا تو چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی طرف اہلِ علم و فن نے رخ کیا۔ ان ریاستوں میں سے ایک

رامپور بھی تھی، لیکن اس زوال سے پہلے بھی دربار رامپور نے علم وفن کی سرپرستی کی۔ اردو کا بہت بڑا خزانہ، مخطوطات کی شکل میں ہی سہی رامپور میں موجود ہے۔ اسے عالمی مقبولیت بھی حاصل رہی ہے۔ اس کی مقبولیت کی غیر ملکی شہادت مجھے بھی نصیب ہوئی ہے۔ میں جنوری ۱۹۹۰ء میں UNO کی ایک شاخ UNFPA کے بین الاقوامی پندرہ روزہ ورکشاپ میں ہندوستان کی نمائندگی کر رہا تھا۔ یہ ورکشاپ قاہرہ میں جامعہ ازہر کے میڈیکل کالج میں ہوئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی جب ایک صبح ناشتہ پر مجھ سے ورکشاپ کے کنوینر پروفیسر نے مجھ سے پوچھا کہ میں اس شہر سے تو نہیں آیا ہوں جہاں مخطوطات کی ایک بہت بڑی لائبریری ہے؟ یہ کام واقعی نوابینِ رامپور کا ہے کہ انہوں نے علم و ادب کی سرپرستی کر کے اپنے کتب خانہ کو عالم گیر شہرت عطا کر دی۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اردو کو سرکاری زبان کا مرتبہ عطا کر دیا تو تقریباً تمام ریاستوں کی درباری زبان بھی اردو ہوگئی۔ اسی دور سے رامپور کے دربار نے بھی اردو کو باریابی عطا کی۔ دربار کی حد تک تو یہ بات درست تھی کہ اس نے روشِ حکم رانی اختیار کی لیکن عوام نے فارسی کے بجائے اردو کو اپنایا۔ علاقۂ رُوہ کی زبان بے شک پشتو تھی، اسی لیے یہ لوگ 'پشتون' اور 'پختون' بھی کہلاتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں ان کی آمد رفتہ رفتہ رہی ہے، اسی لیے وہ نئی سرزمین میں رائج زبان کو اختیار کرتے گئے۔ افہام وترسیل کے لیے یہی روش مناسب وموزوں تھی۔ ان کا انتقالِ مکانی چوں کہ رفتہ رفتہ ہوا اس لیے وہ نئی سرزمین کی زبان اختیار کرنے کے پابند ہوئے۔ وہ اگر ایک ہی وقت میں ہجرت کرتے تو ان کی اپنی زبان ان کے ساتھ قائم وباقی رہتی۔

نئی زبان کو اختیار کرتے وقت نئی لفظیات کو اپنانا ہوتا ہے، لیکن اس عمل میں خود اپنی زبان کے کچھ الفاظ مابقا کی طرح اجنبی زبان میں ضم ہو جاتے ہیں۔ روہیلکھنڈ کی زبان کے ساتھ بھی یہی ہوا، یعنی پشتو زبان کے بہت سے الفاظ اس میں باقی رہ گئے۔ ان کی وجہ

سے زبان کے لہجہ (Intonations) میں بھی امتیاز پیدا ہو گیا۔ یہاں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ بول چال میں جو تبدیلی ہوتی ہے وہ تحریر میں نہیں ہوتی علاوہ اس کے کہ چند ضمائر، عواطف، تذکیر و تانیث اور واحد و جمع میں فرق پیدا ہو جائے۔ اس لحاظ سے رامپور کی بولی دلّی کی بولی سے زیادہ قریب رہی ہے۔ اس کا لہجہ کرخنداری لہجہ سے زیادہ مماثل رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء تک پورے ہندوستان کا مرکزِ حوالہ دلّی رہا ہے، اس لیے تمام معاشرتی عمل و تعامل (Social Interactions) میں دہلی ہی کو سند حاصل رہی ہے۔

جب معاملاتِ حکمرانی اور روز مرہ کی زندگی میں حوالہ دلّی کی طرف ہو تو شعر و ادب میں اس رخ کا اہمیت اختیار کرنا فطری بات تھی، اس طرح دلّی کا اثر قابلِ قبول بنا۔ جب تک دلّی دربار اپنی محدود ترین حالت میں قائم رہا اس کی ادبی سند معتبر رہی اور تمام قرب و جوار کی ریاستوں میں اس کا حوالہ اپنی لسانی توانائی کے ساتھ باقی رہا۔ دلی کے ادبا و شعرا کو رامپور کی طرف راجع کرنا اور خود اہلِ فکر و فن کا اس دربار میں رسائی حاصل کرنا اہمیت رکھتا تھا۔

علم و ادب ایک مہنگا کام تھا جس کی ہمت کوئی عام آدمی یا اس سے بہتر حیثیت کا شخص نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں وقت اور سرمایہ لگتا تھا جو بہتر اوسط معیارِ زندگی کے فرد کے بس کی نہیں تھی۔ چھاپے کے تعارف سے پہلے سارا کام قلمی یا ہاتھ سے ہوتا تھا، جس میں وقت بھی لگتا تھا اور کاتب کو قوتِ لایموت کی ضرورت بھی ہوتی تھی۔ ان ضرورتوں کی تکمیل صرف وہ امراء کر سکتے تھے جو اصحابِ ثروت ہوتے تھے۔ علم و ادب کی اہمیت ان کے دربار میں دوسرے فنون و حرفہ کی ہوتی تھی۔ شاعری خود صاحب تخت کا امتیاز ہوتی تھی۔ اس ضرورت کے لیے استاد شعراء کا تقرر ہوتا تھا جو رؤساء و نوابین کی مدح سرائی کے علاوہ ان کے کلام کی اصلاح بھی کیا کرتے تھے۔

نوابینِ رامپور میں تقریباً سب ہی شاعر تھے اور باتخلص تھے۔ ان کے درباروں میں شاعروں کی محفل جمی رہتی تھی۔ دہلی و لکھنؤ کے شاعروں کی مسلسل آمد رہتی تھی۔ جب تک دلّی دربار میں اتنی سکت رہی کہ وہ شعرا کی پرورش کرے اصحابِ کلام اس سے وابستہ رہے، لیکن جب اس کی بنیادیں کمزور ہونے لگیں تو تقریباً تمام اہلِ کمال نے ان درباروں اور ریاستوں کی طرف رخ کیا جو اس حلقہ کی پذیرائی کر سکیں۔ ان درباروں میں سے ایک دربارِ رامپور بھی تھا۔ اس نے اپنا حق ادا کیا اور غالب، امیر، داغ، قائم، نظام وغیرہ کی سرپرستی کی۔

تصنیف و تالیف کا کام عام لوگوں کے بس کی بات نہ تھی، اس لیے یہ بار رؤساء برداشت کرتے تھے۔ کتب خانہ کی نوعیت یہ ہوتی تھی کہ استفادہ کے خواہشمند حضرات ان رؤساء کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، درخواست گزار ہوتے تھے اور کتابوں تک رسائی حاصل کرتے تھے۔ یہ امر باعثِ افتخار ہوتا تھا کہ کتب خانہ کی وسعت اور تنوع کیا ہے؟ استفادہ کرنے والوں کی وسعت کتنی ہے؟ اور ہر کتب خانہ کا تنوع کیا ہے؟ اس کی ندرت کیا ہے؟ رامپور کے کتب خانہ کا امتیاز اس کے مخطوطات رہے ہیں۔ ادبی نوعیت سے یہاں داستانوں کا خزانہ بے مثال ہے، لیکن شعر و ادب کے علاوہ دوسرے علوم و فنون پر بھی کچھ کام نہیں کیا گیا ہے۔ نوابینِ رامپور کی توجہ او دلچسپی نے اسے ایک یادگار علمی و ادبی مرکز بنا دیا ہے جس کا اعتراف ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔

تقسیمِ ملک کے بعد اور ریاست کے ضم ہو جانے کے بعد سابقہ ریاست رامپور کی اردو میں خاطر خواہ تبدیلی آئی ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ ہے کہ اب ادب کا حوالہ لکھنؤ بن گیا ہے۔ اس کی قواعد کے امتیازات اب زیادہ تر اسی کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ وہ کرخت لہجہ جو یہاں کی بولی کو کرخنداری سے کسی حد تک مماثل کیے ہوئے تھا وہ اب نرم اور دلنواز ہو گیا ہے۔ ـکیا، ـگیا، ـدِیا وغیرہ کا تلفظ اب وہی ہو گیا ہے جو اصل اردو میں ہے۔ یعنی

اب عرفِ عام میں کہا، گیا، رہا وغیرہ بولا جاتا ہے۔ اس طرح کے مقامی لہجہ کا فرق جو اسے قرب وجوار کے لہجہ سے متمیز کیے ہوئے تھا وہ رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا ہے۔ اس تبدیلی سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ انضمامِ ریاست کے بعد رامپور نے ریاست سے باہر کے اثرات کو بہت تیزی کے ساتھ قبول کیا ہے اور کر رہا ہے۔ یعنی وہ Isolation جو وہ اب تک برقرار رکھے ہوئے تھا اسے معاشرتی عمل وتعامل نے ختم کر دیا ہے اور ایک سماجی تسلسل وجود میں آتا جا رہا ہے۔ یہ فطری عمل ہے جسے قصد وارادہ سے شعوری طور پر کاربند نہیں کیا جا سکتا۔ اسے عوام اپنی ترسیلی ضرورتوں کے تحت وجود بخشتے ہیں۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔

رامپور کی زبان وادب پر یہاں کے ترسیلی وسائل میں اچانک توسیع کا بھی غیر معمولی اثر پڑا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشاعتی وطباعتی سرگرمیاں یہاں ہمیشہ جاری رہی ہیں اور بعض معاملات میں اسے اوّلیت بھی حاصل رہی ہے۔ مثلاً، اردو کا پہلا اخبار ''دبدبۂ سکندری'' رامپور سے جاری ہوا اور سو سال سے زیادہ عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ اس ایک اخبار کے علاوہ دو چار اور اردو اخبارات یہاں سے اب تک شائع ہو رہے ہیں۔ روزناموں کے علاوہ ماہانہ رسائل بھی عرصہ سے شائع ہو رہے ہیں جنہوں نے رامپور کو پوری اردو دنیا میں معروف مقام عطا کر دیا ہے۔ رسائل وجرائد کے علاوہ یہاں اہم اور بڑے طباعتی اداروں کا بھی قیام رہا ہے۔ اس میدانِ کار نے اردو دنیا میں اسے ایک اہم گہوارے کی حیثیت دے دی ہے۔ ان وسائل کے ذریعہ رامپور نے دنیائے علم وادب میں غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ مزید برآں ان خدمات کی وجہ سے اسے فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

شبیر علی خاں شکیب

قائم چاند پوری ثُم رامپوری

(غالبؔ اور دوسروں کی نظر میں)

اہلِ رامپور کے لیے یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ یہاں غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی اور رضا لائبریری رامپور کی مشترکہ مساعی سے دوروزہ غالبؔ سمینار منعقد ہورہا ہے۔ غالبؔ کی آفاقیت اپنی جگہ مسلّم لیکن ہندوستان کے تین شہروں کو ان کی زندگی سے جو تعلق ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ آگرہ جہاں ان کا لڑکپن گزرا، دلی جہاں کی گلیوں میں ان کی جوانی بیتی اور رامپور جس نے ان کے لئے عصائے پیری کا کام کیا۔ جہاں کے ایک فرمانروا نواب یوسف علی خاں ناظمؔ جیسے قدر دانِ شعروادب نے ان کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کی اور اس کے لائق فرزند نواب کلب علی خاں نواب نے انہیں سرآنکھوں پر بٹھائے رکھا۔ اور ناظمؔ اور نظامؔ کے علاوہ رامپور کے دس دیگر شعرا کو ان کی شاگردی کا فخر حاصل رہا۔

اردو فارسی کے اس عظیم شاعر کا قائمؔ چاندپوری کے توسط سے بھی رامپور سے ایک گہرا تعلق ہے اور اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ شعرائے متقدمین میں سودا (متوفی

۱۷۸۱ء)، میر (متوفی ۱۸۱۰ء) اور قیام الدین محمد قائم (متوفی ۱۷۹۴ء) تین بڑے شاعر ہوئے۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں دلی کی سیاسی اور معاشی ابتری نے ان کو ہجرت پر مجبور کردیا۔ سودا اور میر لکھنؤ کے اور قائم رامپور کے حصے میں آئے۔ جہاں انہوں نے اپنی عمر کے آخر میں دلی کی سیاسی اور معاشی ابتری نے ان کو ہجرت پر مجبور کردیا۔ سودا اور میر لکھنؤ کے اور قائم رامپور کے حصے میں آئے جہاں انہوں نے اپنی عمر کے آخری بیس سال گزارے اور اپنے شاگرد نواب محمد یار خاں امیر (برادرِ اصغر نواب فیض اللہ خاں والی رامپور) کے احاطہ قبرستان کے جنوب مغربی گوشے میں مدفون ہیں۔ قائم کا ذکر تذکروں میں تو آتا رہا لیکن لکھنؤ کے مقابلے میں رامپور جیسی چھوٹی بستی میں ان کے قیام کی بنا پر نہ میر و مرزا کی طرح ان کے کلام کی اشاعت میں ممکن ہوسکی، نہ اہلِ قلم ان پر توجہ دے سکے جو میر اور سودا کو حاصل ہوسکی اور سب سے بڑھ کر خود" قائم اپنے پہلے استاد خواجہ میر درد جیسے صوفی بزرگ کی اخلاقی تعلیم کی بنا پر تصوف کی طرف مائل ہوتے گئے اور صوفیانہ لباس زیب تن کر کے ایک دن وہ نام و نمود کی آرزو سے بیگانہ ہوگئے۔

فلک جو دے تو خدائی بھی اب نہ لے قائم
گئے وہ دن کہ ارادہ تھا پادشاہی کا

نتیجہ ظاہر ہے کہ وقت کے ساتھ عوام ان سے دور ہوتے گئے۔ خواص کے بڑے طبقے نے بھی ان کو سودا کا شاگرد قرار دے کر لائق اعتنا نہ سمجھا اور بیسویں صدی کے آغاز میں نوبت یہاں تک پہونچی کہ بعض حضرات کی نظر میں قدما میں صرف دو بڑے شاعر میر و مرزا رہ گئے۔ ایک آدھ نے درد کو آدھا شاعر مان کر ڈھائی شعرا کی اصطلاح وضع کرلی۔ غالباً قائم نے حسب ذیل شعر پیشنگوئی کے طور پر کہا تھا۔

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قائم
شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

مرتبین دیوان سودا نے مردے کا حال سمجھ کر قائم کی ایک لاجواب مثنوی "شدتِ سرما" اور اس شعر کو سودا کے دیوان میں شامل کر دیا۔

ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

قائم کا رتبہ شاعری: تمام تذکرہ نگاروں نے قائم کو مسلم الثبوت استاد تسلیم کیا ہے اور ان کے مرتبہ شاعری کو متعین کرتے ہوئے بعض نے انہیں میر و سودا کے برابر اور بعض نے انہیں ان دونوں پر فوقیت دی ہے۔ مصحفی اور شاہ کمال تذکرہ نگاروں کی رائے میں فنی مہارت، روانی طبیعت اور فضل و ہنر میں کہیں کہیں قائم، سودا پر سبقت لے جاتے ہیں۔ احمد علی یکتا مولف دستور الفصاحت کے خیال میں قائم تالیف کلمات اور بندش الفاظ میں سودا کے اور شکستگی اور برشتگی میں میر کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ راقم الحروف کی رائے میں بھی قائم کے یہاں ان دونوں کا رنگ جھلکتا ہے اور کبھی کبھی یہ حسین امتزاج زیادہ پر لطف اور پر کیف بن جاتا ہے۔ خود قائم کو بھی اس کا احساس تھا:

قائم سوائے اور بھی شاعر ہیں یاں بہت
لیکن یہ حرفِ درد و گپ عاشقانہ کو

اور واقعی ان کے کلام میں میر کا سا 'حرفِ درد' اور سودا کی 'گپ عاشقانہ' دونوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

یکتا نے دستور الفصاحت میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ سودا کے شاگرد ضرور تھے لیکن قائم نے استاد کی طرح جملہ اصناف شاعری میں دادِ سخن دی ہے۔ ان کے یہاں ہر صنف کی حد سے تجاوز نہیں کیا گیا ہے۔ یعنی شعری اصناف کی تشکیل مخصوص فنی تقاضوں کی پاسداری کی ہے۔ نہ غزل اتنی بھاری بھرکم اور طویل ہے کہ قصیدہ معلوم ہونے لگے اور نہ قصیدے میں اتنی ملائمیت ہے کہ غزل کا شبہ ہو۔ بظاہر یہ سودا اور میر کی طرف اشارہ ہے۔

قائم کے رنگِ سخن کی مقبولیت:

کئی برس ہوئے اردو اکادمی دہلی کے تحت غالب اکادمی میں ایک سہ روزہ غزل سمینار منعقد ہوا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن کا مقالہ سودا پر تھا۔ انہوں نے من جملہ دیگر باتوں کے یہ بھی فرمایا کہ شعرائے مابعد نے نہ میر کا رنگ سخن اختیار کیا نہ درد کا بلکہ سودا کے رنگ کو پسند کیا۔ یہاں تک کہ غالب اور اقبال نے بھی اسے ترجیح دی۔ نیاز مند نے وقفہ سوالات کے دوران اتنی ترمیم کی درخواست کی کہ سودا کا رنگ براہ راست مقبول نہیں ہوا، ان کے شاگرد رشید قائم کے توسط سے ہوا اور ایک طور پر اسے قائم کا رنگِ سخن کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ یہ سودا اور میر دونوں کے رنگوں کا امتزاج ہے۔

قائم مرزا غالب کی نظر میں:

قائم کے رنگ سخن اور کلام سے متاثر ہونے والوں میں یوں تو ان کی رامپوری شاخ کے کئی شعرا اور دہلوی شاخ کے مومن اور حسرت موہانی وغیرہ کے نام آتے ہیں لیکن ان سب میں ہمارے عظیم شاعر مرزا غالب پیش پیش نظر آتے ہیں۔

غالب نے فارسی شاعری کے اساتذہ سے مستفید ہونے کا کھل کر شاعرانہ انداز میں ذکر کیا ہے:

> ''شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ مجھ میں تھا اُس کو فنا کردیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر میں زادِ راہ باندھا اور نظیری لا ابالی خرام نے اپنی خاص روش پر چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ فرشتہ مشکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلکِ رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار،

جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا'' (یادگار غالب)

غالب جیسی جسارتِ اعتراف اور پس رو اساتذہ سے مستفید ہونے کا اقرار کم ہی شعرا میں نظر آئے گا۔ ان کے فارسی کلام میں متعدد اشعار کو فارسی شعرا کا چربہ ثابت کیا ہے لیکن ان کی عظمت ختم نہ ہو سکی۔ کسی معترض نے ان کے شعر کے بارے میں جب یہ کہا کہ آپ کو فلاں سے توارد ہو گیا ہے تو انہوں نے کس بے تکلفی سے جواب دیا کہ اُس شاعر نے نہاں خانۂ ازل سے میرا مضمون چرا لیا تھا۔ غریب معترض اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر کسی پس شاعر کے شعر میں اضافہ ہو سکے تو توارد جائز ہے۔

اسی طرح اردو شاعری میں بھی ان کا رویہ کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ ابتدا میں مرزا بیدلؔ کی مشکل پسندی اختیار کی۔ اس کے بعد معتقد میرؔ ہونے کا اعلان کیا: آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں۔ غرضیکہ انہوں نے قدما کے کلام سے بے تکلف استفادہ کیا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

میرؔ کے بارے میں ان کی رائے شعر کی صورت میں ہونے کی وجہ سے لوگوں میں کافی مشہور ہو گئی جبکہ قائم کے سلسلے میں انہوں نے اپنے خطوط میں جو کچھ کہا ہے اس سے قدرتاً کم لوگوں کو واقف ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب بنام عبدالغفور سرورؔ میں اردو شاعری کو نکھارنے اور سنوارنے والوں میں میرؔ و سودا کے ساتھ قائم کا ایک ایک شعر پیش کر کے ثابت کرتے ہیں کہ ان شعرا کی مساعی سے آج اردو زبان فارسی کے بالمقابل کھڑی ہے اور اس میں فارسی کی طرح ''چیزے دیگر'' پائی جاتی ہے ''ہاں اردو زبان میں اہلِ ہند نے وہ بات پائی ہے'' اور قائمؔ کا یہ شعر بطور مثال پیش کیا ہے:

قائمؔ اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں
ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بہ آموز نہیں

غالب کی نظر میں قائم کا کیا مقام تھا، اس کا اندازہ ان کے ایک دوسرے مکتوب بنام بخبر سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک شعر استاد (مراد قائم) کا مدت سے تحویل حافظ میں چلا آتا ہے۔

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ ہی من گیا

میں نے از راہِ تصرف اس شعر کی صورت بدل دی:

ان دلفریبیوں پہ نہ کیوں اس پہ جان دوں
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

غالب کے اردو کلام پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو معقول تعداد میں ایسے اشعار ملیں گے جو عمدہ اور مشہور ہیں۔ مضمون اور لہجے کے اعتبار سے غالب نے قائم کے کلام سے بے تکلف استفادہ کیا ہے۔ یہاں چند اشعار بطور مثال پیش ہیں۔

(۱) غالب:

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

قائم:

وہ دن گئے کہ اٹھاتا تھا بار نکہتِ گل
ہے بے دماغی دل ان دنوں گراں مجھ کو

(۲) غالب:

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

قائمؔ:

دل ڈھونڈنا سینے میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

(۳)غالبؔ:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

قائمؔ:

جہاں میں شہرتیں مجنوں کی ذلتیں کیا کیا
سو بارے عہد میں تیرے وہ نیکنام ہوا

(۴)غالبؔ:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

قائمؔ:

خاک ہے اس مہرِ گردوں پر کہ اس ماٹی کے بیچ
صورتیں کیا کیا دیں اتنی خرم و شاداب داب

(۵)غالبؔ:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا کاشکہ مکاں اپنا

قائمؔ:

جی میں ہے اس سرے پہ عالم کے
جا کوئی جھونپڑا بنایئے گا

غالبؔ:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

قائم:

مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجئے سجدہ
محراب نہ ہو خم جو برائے تعظیم

(۷) غالبؔ:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

قائم:

آدمی ہونا بہت مشکل ہے قائمؔ زیرِ چرخ
یوں تو سب کہتے ہیں ہم آدم ہیں پر آدم کہاں

(۸) غالبؔ:

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

قائم:

فقط شاعر نہیں ہم بلکہ قائمؔ
ہمارا یہ بھی ادنیٰ ایک فن ہے

(۹) غالبؔ:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

قائم:

کوئی اپنی خاطر ایسا کہیں اک مکان ہووے
کہ نہ یہ زمین ہوواں نہ یہ آسمان ہووے

بعدِ زمانی کے باوجود دونوں شاعروں میں کس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ غالب نے مضمون اور لہجے دونوں میں قائم سے استفادہ کیا ہے۔ غالب نہیں اردو کے دوسرے بڑے شاعروں کے یہاں بھی قائم کے کلام کی صاف جھلک نمایاں ہے۔ مثلاً:

(۱۰) مومن:

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

قائم:

ہوس ہے عشق کی اہل ہوا کو ہم تو میاں
سنے ۔۔ نام محبت کا زرد ہوتے ہیں

مومن نے دادا استاد کے ایک عمد شعر کے لہجے میں الفاظ ''کہ بس'' لے کر اضافہ کر دیا ہے۔ بہت بعد میں رامپور کے ایک مر شاعر عندلیب شادانی نے قائم کے مضمون کو کس خوبی سے پیش کیا ہے۔

(۱۱) عندلیب شادانی:

جب کسی سے کوئی پیمان وفا کرتا ہے
کانپ جاتا ہوں کہ میرا ہی سا انجام نہ ہو

قائم کا ایک شعر ہے:

(۱۲)

اہل مسجد نے جو کافر مجھے سمجھا تو کیا
ساکنِ دیر تو جانے ہے مسلماں مجھ کو

بعد کے ایک شاعر مفتی عبدالقادر خاں غمگین رامپوری (متوفی ۱۸۴۹ء) نے اس مضمون کو

قطعہ کی صورت میں پیش کیا:

قطعہ:

حرم میں برہمن رکھا نام میرا گیا دیر میں تو مسلمان ٹھہرا

پر اُس بت کے نزدیک کیا جانے غمگیں ہو اکھڑتا بت کہ ایمان ٹھہرا

کیا قائم کے شعر کی چھاپ علامہ اقبال کے اس شعر میں نظر نہیں آتی:

علامہ اقبال:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا

اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

استاذ الاساتذہ مصحفی کو جوانی کے زمانے میں قائم کے ساتھ نواب محمد یار خاں امیر کے دربار میں بمقام ٹانڈہ کچھ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ پروفیسر اقتدا احسن مولف کلیاتِ قائم کی رائے میں مصحفی شاگرد نہ سہی، اکتساب فن ضرور کیا ہے۔ مصحفی کا ایک مشہور شعر ہے جو ان کے کلام میں الگ نظر آتا ہے:

(۱۴)

مصحفی:

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم

کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

نقوشِ اول کے طور پر قائم کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

قائم:

(۱)

جاتی ہے نسیم اُس گلی کو

اُٹھ سکیے تو قافلہ ہے بہتر

(۲)

حُسن نمط ساتھ موج کے لگ لے
بہتے بہتے کہیں تو جائے گا

مصحفی نے قائم کے دونوں شعروں کو جس خوبی سے سمولیا ہے اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔
اردو غزل کے تن مردہ میں جان ڈالنے والے حسرتؔ موہانی، مومنؔ کے واسطے سے قائم کی دہلوی شاخ میں تھے۔ ان کا یہ مصرعہ اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔

حسرتؔ ترے دم سے ہے طرزِ سخن قائمؔ

قائمؔ کے ان دو اشعار کی جھلک حسرت موہانی کے یہاں بھی ملتی ہے:

(۱)

اُس حسن نیم رنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ
ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

(۲)

پُر ہے یہ مے کے رنگ سے اب کے ایاغِ گُل
جھمکے ہے مثلِ شعلہ پر اک سو چراغِ گُل

آخر میں مفتی صدرالدین آزردہ کے قائمؔ کے حسب ذیل سیدھے سادے شعر میں لہجے کا کتنا عمدہ اضافہ کرایا ہے۔

قائم:

یار اگر چاہتا ہے دے قائمؔ
جان کچھ دل سے تو زیاد نہیں

آزردہ:

(۲) اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں

اک جان کا زیاں سو ایسا زیاں نہیں

ان چند مثالوں سے واضح ہو سکے گا کہ شعرائے مابعد نے قائم کے طرز سخن کو قبول کیا۔

ابوسعد اصلاحی

رضا لائبریری میں غالبیات کا ذخیرہ

رضا لائبریری میں غالبیات کے موضوع پر جس قدر کتابیں موجود ہیں لائبریری اس پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ غالب کی زندگی سے لے کر آج تک اس موضوع پر جتنی بھی اہم کتابیں اور ریفرنس ہیں ان میں سے بیشتر یہاں دستیاب ہیں اس موضوع پر خصوصی توجہ اور دلچسپی کا سبب۔ غالب کا رام پور سے گہرا تعلق ہے۔

اس تعلق کی ابتدا اس وقت ہوئی جب مرزا غالب دلی میں رہتے تھے اور نواب غلام محمد کے خاندان کے افراد بھی دلی میں مقیم تھے چونکہ یہ لوگ صاحب علم وفضل تھے اس لیے غالب کے روابط اس خاندان سے پیدا ہوئے۔ خاص طور پر نواب عبداللہ خاں جو نواب محمد سعید خاں کے بڑے بھائی تھے ان سے غالب کے گہرے مراسم تھے۔ اس کے علاوہ دلی میں نواب یوسف علی خاں کے استاذوں میں منشی صدرالدین خاں آزردہ، مولوی فضل حق خیرآبادی کیساتھ مرزا غالب بھی ان کے فارسی کے استاد تھے۔

۱۸۴۰ء میں جب محمد سعید خاں تخت نشین ہوئے تو اس وقت نواب سید عبداللہ نے

مرزا غالب سے نواب سعید محمد خاں کی شان میں قصیدہ لکھنے کی درخواست کی تھی لیکن غالب نے معذرت کے ساتھ ان کا انکار کر دیا لیکن بقول مولانا عرشی "مرزا نے جس کام کے سرانجام نہ پانے کا عذر کیا تھا چند سال کے بعد قدرت وہی کام لینے والی تھی" چنانچہ جب ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں ریاست رام پور کے روبرو ہوئے تو مولانا فضل حق خیر آبادی کی کوششوں سے مرزا غالب کے نواب یوسف علی خاں سے تعلقات کی تجدید ہوئی۔ مولانا کی ترغیب پر مرزا غالب نے ۲۸رجنوری ۵۷ء کو پہلا خط نواب یوسف خاں کو لکھا جواب میں نواب یوسف خاں نے ۵رفروری ۵۷ء کو اپنے اشعار بغرض اصلاح مرزا غالب کی خدمت میں بھیجا۔ ۱۲رفروری ۵۷ء کو مرزا غالب نے غزل موصول ہونے کی اطلاع دی۔ ۱۵رفروری ۵۷ء کو اصلاح شدہ غزل واپس کی اور تخلص کے لئے چند نام تجویز کیا۔ جواب میں نواب صاحب نے ناظم تخلص پسند کرنے کا خط بھیجا۔ اس خط وکتابت سے حوصلہ پا کر مرزا غالب نے نواب یوسف علی خاں کی مدح میں ایک قصیدہ نظم کیا نواب یوسف علی خاں مستقل طور پر مرزا غالب سے اصلاح لیتے رہے اور عیوض میں بطور معاوضہ کچھ رقم بھی ارسال کرتے رہے۔ نواب صاحب نے کئی بار غالب کو رام پور آنے کی دعوت دی لیکن ہر بار مرزا غالب کسی نہ کسی عذر کی وجہ سے رام پور نہیں آسکے۔ لیکن ساتھ ہی اپنی معاشی بدحالی کے بارے میں نواب صاحب کو لکھتے رہے یہاں تک کہ دربار سے ۵۹ء میں انہیں سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ وظیفے کی رقم جولائی ۵۹ء سے شروع ہو کر مرزا غالب کے انتقال تک برابر مرزا کو ملتی رہی۔ عطیات کا سلسلہ ۵رفروری ۵۷ء سے شروع ہو کر مرزا کے انتقال تک جاری رہا۔ پہلی بار مرزا غالب ۲۷رجنوری ۱۸۶۰ء کو رام پور آئے اور کوٹھی باغ میں نواب صاحب کے مہمان ہوئے۔ چار دن گزارنے کے بعد نواب صاحب نے رہائش کے لئے علیحدہ مکان دیا۔ یہ مکان راجدوارہ محلہ میں تھا۔ جسے تلاش کر کے ۲۱رفروری ۱۹۴۴ء کو ایک یادگار پتھر لگا دیا گیا تھا۔ یہ پتھر اب لائبریری میں محفوظ ہے۔ تقریباً

ایک مہینہ ۲۰ دن قیام کر کے ۱۷ر مارچ ۶۰ء کو رام پور سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ (مکاتیب ۹۵، ۱۰۲)۔

غالب نے رام پور کا دوسرا سفر نواب کلب علی خاں کی تاج پوشی کے موقع پر کیا۔ ۱۲ر نومبر ۱۸۶۵ء کو رام پور پہنچے۔ جرنیل کوٹھی میں قیام رہا پھر ۲۸ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو دہلی واپس چلے گئے۔ (مکاتیب ۱۱۵)۔

غالب کے رام پور سے یہ وہ خاص تعلقات جس کی بنیاد پر رضا لائبریری میں غالبیات سے متعلق اتنا اہم مواد جمع کیا گیا اس لائبریری کے ذخیرے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں غالب کے اہم دواوین و دیگر تصنیفات کے قابل قدر نسخوں کی اصل یا نقل موجود ہے اس کے علاوہ سب سے اہم چیز غالب کے وہ خطوط ہیں جو غالب نے رام پور ریاست کے نوابین اور دیگر لوگوں کو لکھے تھے۔ مولانا عرشی مکاتیب غالب میں لکھتے ہیں۔

نواب رام پور سے مرزا غالب کی مراسلت بارہ سال تک جاری رہی۔ اس عرصہ میں اہل رامپور سے ان کے خاصے تعلقات قائم ہو گئے اور متعدد اصحاب سے خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ سوئے اتفاق سے ان کی مراسلت کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ اس مجموعے (مکاتیبِ غالب) میں صرف وہ خط مرتب کیے گئے ہیں جو دارالانشاء میں محفوظ تھے۔ اس میں مکاتیب کی تعداد ۱۲۹ ہے۔ جس میں سے ۴۳ خط نواب یوسف علی خاں کے نام اور ۷۳ نواب کلب علی خاں کے نام کے، ۲ صاحبزادہ سید زین الدین خاں بہادر کے نام کے، ۲ صاحبزادہ عباس علی خاں بہادر تخلص بیتاب کے نام کے، ۷ منشی سہل چند میر منشی کے نام، ایک خلیفہ اور علی احمد رامپور کے نام اور ایک مولوی محمد حسین خاں مدیر ذبذبہ سکندری کے نام کے ہیں۔

گم شدہ خطوط کے بارے میں مولانا عرشی صاحب لکھتے ہیں نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے فرامین کے مسودوں نیز مرزا صاحب کے زیر نظر مکاتیب

میں تقریباً ۱۱۳۵ ایسے خطوط کے حوالے ملتے ہیں جو نسخوں میں موجود نہیں ہیں یہ سب خط بھی محفوظ ہوتے تو مکاتیب غالب کی تعداد ۳۶۴ ہوتی۔ (مکاتیب ۴۔۲۵۳)

غالب کے ان خطوط کی ایک قلمی نقل، مکتوبات مرزا غالب کے نام سے لائبریری میں موجود ہے جس کا نمبر اردو مخطوطہ نمبر ۲۶۹ ہے یہ نسخہ ۵۱ ورق پر مشتمل ہے۔ کتابت لائبریری کے ملازم سید عزت علی اور مولوی عبداللہ کے قلم کی ہے یہ نسخہ مکاتیب غالب کی ایڈیٹنگ کے وقت مولانا عرشی کے پیش نظر رہا ہے جگہ جگہ مولانا کے نوٹ درج ہیں خطوط کی ترتیب مکاتیب غالب سے مختلف ہے مثلاً پہلا خط یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء کے خط کی نقل ہے جو مکاتیب غالب میں خط نمبر ۱۴ ہے۔

مکتوبات غالب کے علاوہ لائبریری کے ذخیرے میں غالب سے متعلق کتابوں میں دیوان غالب کے قلمی نسخے اہمیت کے قابل ہیں۔

فہرست مخطوطات اردو میں دیوان غالب کے ۹ نسخوں کا اندراج ہے جس میں سے چار نسخے جن کے نمبر ۹۹۱، ۱۰۱۱، ۱۰۱۳ اور ۱۰۱۴ ہیں۔ لائبریری کے اصل نسخہ ہیں باقی پانچ نسخے جن کے نمبر ۲۰۲، ۱۰۱۲، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳ اور ۱۴۲۵ ہیں علی الترتیب دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۴۱ و ۱۸۴۷ کی نقل اور مطبوعہ ۱۸۴۱؛ نسخہ شیرانی و نسخہ لاہور کے فوٹوگراف ہیں۔

دیوان غالب مخطوطہ نمبر ۱۰۱۱ لائبریری کے نسخوں میں سب سے قدیم ہے۔ اس میں ۲۹ ورق ہیں اشعار کی تعداد ۱۰۶۷ ہے اس نسخے کی سب سے اہم بات مولانا عرشی نے تحریر کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ نسخہ متداول دیوان کا پہلا ایڈیشن ہے جو حسب تصریح نسخہ شوق قدوائی خیر ۱۲۴۸ مطابق ۱۸۳۳ میں مرتب ہوا تھا (نسخہ عرشی ۱۰۳)

کالی داس گپتا رضا نے بھی تحریر کیا ہے کہ اردو دیوان کا پہلا ایڈیشن، اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا لیکن اسے کم از کم ساڑھے آٹھ سال پہلے مرتب کیا جا چکا تھا یہ بات دیباچے سے ظاہر ہے جو غالب نے ۱۶ اپریل ۱۸۳۳ء کو تمام کیا تھا۔

دیوان غالب مخطوطہ نمبر ۹۹۱۔ یہ غالب کے دیوان کا انتخاب ہے، لائبریری میں دیوان مومن (متوفی ۱۸۵۲ء) کا ایک اہم نسخہ ہے جسے مومن نے خود دیکھا تھا اور اصلاح درج کی تھی اس نسخے کے شروع اور آخیر میں متعدد اوراق ہیں شروع میں ۱۵ب تک ہندی کتب ہیں ۱۶ اب سے غالب کے دیوان کا انتخاب شروع ہوتا ہے جو ورق ۲۱ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں غالب کے ۱۸۶ اشعار درج ہیں۔ مولانا عرشی کے بقول یہ انتخاب کئی وجوہ سے اہم ہے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میرزا صاحب کے متداول دیوان کا اتنا قدیم انتخاب کوئی دوسرا موجود نہیں دوسرے اس انتخاب کا متن جگہ جگہ متداول نسخوں سے الگ ہے۔ نسخہ میں تاریخ کتابت درج نہیں ہے لیکن بعض قرائن کی مدد سے مولانا عرشی نے انتخاب کا زمانہ ۱۸۳۶ء متعین کیا ہے۔

دیوان غالب مخطوط نمبر ۱۰۱۳۔ اس مخطوطے کا تعارف نسخہ عرشی میں مولانا عرشی نے نسخہ رام پور جدید سے کرایا ہے۔ نسخہ ۴۷ ورق پر مشتمل ہے۔ کاتب کا نام وسنہ کتابت درج نہیں ہے۔ مولانا عرشی نے نواب فخر الدین محمد خان بہادر کو جنہوں نے نسخہ لاہور کی کتابت کی ہے کو اس نسخے کا کاتب بتایا ہے۔ سنہ کتابت کے سلسلے میں لکھتے ہیں ''چونکہ یہ نسخہ مرزا صاحب نے نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور کو ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے پہلے تحفہ میں بھیجا تھا اس لئے اسے تاریخ مذکور سے پہلے کا نوشتہ ہونا چاہیے'' اور چونکہ اس کو زیادہ اہتمام سے لکھوایا اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ نواب ناظم کے لیے ہی تیار کرایا گیا تھا۔ انہوں نے تفریط کی مدد سے اس کا سنہ کتابت ۱۸۵۵ متعین کیا ہے۔ نسخے کی تصحیح مرزا غالب نے خود کی ہے چنانچہ تقریباً، ۴۰ صفحات پر ان کے ہاتھ کی اصلاحیں درج ہیں۔ اس نسخے کی کیا اہمیت ہے اس سلسلے میں تحریر کیا ہے۔

> ''نسخہ رام پور جدید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب نے لفظی معنوی اور ترتیبی لحاظ سے خوب تر بنانے کی سعی

کی تھی اور اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۳ء
والے ایڈیشن کے اور ان کے دیوان کا وہ ایڈیشن ہے جو انہوں
نے از سر نو خود مرتب کیا تھا۔ ان دونوں نسخوں کے درمیان کے
جتنے نسخے ہیں وہ حقیقی معنوں میں ایڈیشن نہیں کہلا سکتے بلکہ وہ
پہلے ایڈیشن کی گویا نقلیں ہیں جن میں نئے کلام کا اضافہ کر دیا
گیا ہے"

آگے اس نسخہ کی جزئیات اور امتیازی خصوصیات کی تفصیل بیان کر کے لکھا ہے۔

مذکورہ امتیازات کے پیش نظر اہل ذوق کو یہ ماننا پڑے گا کہ
انہوں نے لفظی و معنوی حسن میں بالیقین اضافہ کیا ہے اور یہ نتیجہ
ہے اس خصوصی توجہ کا جس سے مرزا صاحب نے اس نسخے کی
ترتیب میں کام لیا ہے۔ اس سے نسخہ رام پور جدید ہی اس اعزاز
کا پورے طور پر مستحق ہے کہ اسے مرزا صاحب کا آخری پسندیدہ
ایڈیشن قرار دے کر آئندہ ایڈیشنوں میں اس کی قرأت اور
ترتیب کو آخری قرأت اور ترتیب کے طور پر برقرار رکھا جائے بجز
ان صورتوں کے جہاں میرزا صاحب نے مزید اصلاح کر دی
ہے۔

اس نسخے کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ نسخہ دیوان غالب کے تیسرے چوتھے اور پانچویں ایڈیشن کی بنیاد ہے اس کی روداد مولانا مہر نے اس طرح بیان کی ہے۔

"۱۸۶۰ء میں دیوان کا نیا ایڈیشن چھاپنے کا خیال پیدا ہوا۔ مئی
۱۸۵۷ء میں اردو دیوان کا ایک نسخہ خوش خط لکھوا کر نواب یوسف
علی خاں والی رام پور کے لیے بھیجا تھا۔ جنوری ۱۸۶۰ء میں رام

پور گئے تو اس کی ایک نقل لے کر نواب ضیاء الدین خاں کی فرمائش کے مطابق ان کے پاس ارسال کر دی۔ رام پور ہی میں تھے کہ عظیم الدین میرٹھی نے اردو دیوان چھاپنے کے لیے خط لکھا واپسی پر وہ میرٹھ پہنچے تو منشی ممتاز علی خان جو غالب کے دوست تھے عظیم الدین کے سفارشی بن گئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے کاپیاں دیکھنے کا ذمہ اٹھایا۔ غالب راضی ہو گئے اور دلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں والا قلمی نسخہ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس میرٹھ بھیج دیا۔ عظیم الدین نے دیوان کا چھاپنا ابھی شروع نہیں کیا تھا کہ منشی شیونرائن اکبر آبادیؔ نے دیوان کے لیے اصرار و ابرام کیا اور کہا کہ بڑے اہتمام سے اپنے مطبع میں چھاپوں گا۔ غالب نے تقاضہ کر کے دیوان عظیم الدین سے واپس لے لیا اور منشی شیونرائن کے پاس آگرہ بھیج دیا وہاں بھی اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی تو دلی میں محمد حسین خاں کے مطبع صدی واقع شاہدرہ میں دیوان چھپوالیا۔ (غالب عبادت بریلوی)

انتخاب غالب مخطوطہ نمبر ۱۰۱۴۔ یہ نسخہ ۶۲ صفحات پر مشتمل ہے اور میرزا غالب کا اصلاح شدہ ہے۔ مولانا عرشی کا اندازہ ہے کہ اس انتخاب کی بنیاد مطبع نظامی کانپور کے مطبوعہ نسخہ پر رکھی گئی تھی کیونکہ اس میں ہر جگہ انتخاب کا متن نسخہ نظامی کے متن سے موافقت رکھتا ہے۔ اس نسخہ کو بھی مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی ماخذوں میں شامل کیا ہے اس سلسلے میں لکھتے ہیں بظاہر حال نسخہ نظامی کی موجودگی میں انتخاب کو استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن مرزا صاحب نے اس میں چند تازہ اصلاحیں کی ہیں اور وہ اہم بھی ہیں اس لیے میں نے اسے بھی اپنے

ماخذوں میں شامل کرلیا ہے۔

انتخاب غالب کا مزید ایک نسخہ جسے مولانا عرشی نے ایڈٹ کر کے مطبع فہیم سے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا ہے۔ یہ نسخہ غالب کے فارسی اور اردو کلام کا وہ انتخاب ہے جو مرزا غالب نے نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر ۱۸۶۶ء میں بذات خود مرتب کیا تھا۔ بشیر حسین زیدی اس انتخاب کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

نواب خلد آشیاں نے فارسی واردو کے چند اشعار کی ایک بیاض مرتب فرمانے کے سلسلے میں مرزا اسد اللہ خاں غالب سے فرمائش کی کہ اپنے اردو و فارسی کلام کا انتخاب ارسال کر دیجیے تا کہ اسے بیاض میں شامل کرلیا جائے۔ ستمبر ۱۸۶۶ء میں مرزا صاحب نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور یکے بعد دیگرے کلیات اردو و فارسی کے خود کردہ انتخابات جداگانہ کتابی صورت میں نقل کرا کے نواب خلد آشیاں کے حضور ڈاک کے توسط سے پیش کیے۔ سرکار کے ملاحظہ کے بعد یہ دونوں نسخے کتاب خانے کو بھیج دیئے گئے۔ اس عہد کے منتظمین کتب خانہ نے صرف فارسی انتخاب کو شعبۂ دواوین میں داخل ہونے کا شرف عطا کیا اور رسم زمانہ کے مطابق انتخاب اردو کو نا قابل حالات خیال کر کے کتاب خانہ کے ردی گھر میں گہری نیند سلا کر مطمئن ہو گئے۔ حسن اتفاق سے مولوی امتیاز علی عرشی ناظم کتاب خانہ نے ردی گھر کی متاع کاملہ کا جائزہ لیتے ہوئے دوسرے نوادرات کے ساتھ اردو انتخاب بھی برآمد کرایا اور مرزا صاحب کی تھکی زندگی کا یہ کارنامہ ملک کے ارباب ذوق کے لئے محفوظ ہو گیا۔

نقل اوٹو گراف: دیوان غالب کے مذکورہ بالا اصل نسخوں کے علاوہ لائبریری میں جو نقل یا اوٹو گراف ہیں وہ بھی نہایت اہم ہیں۔ چنانچہ ذخیرہ اردو میں موجود مخطوطہ نمبر ۲۰۲ اور ۱۴۲۵ دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن، مطبوعہ ۱۹۴۱ء کی نقل اور عکس ہے۔ دیوان غالب کا پہلا ایڈیشن سرسید کے بھائی سید محمد خاں بہادر کے مطبع سید المطابع میں ۱۲۵۷ (۱۸۴۱) کو شائع

ہوا تھا۔ یہ نسخہ ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۰۹۵ اشعار درج ہیں۔ شروع میں غالب کا فارسی دیباچہ اور آخیر میں نواب ضیاء الدین احمد بہادر نیر درخشاں کی تقریظ ہے۔ یہ نسخہ نہایت نایاب ہے اور آسانی سے دستیاب نہیں ہوگا۔ ایک جگہ مولانا عرشی نے لکھا ہے میرزا صاحب کے کلام کے جو قلمی نسخے نیر اور حسین مرزا کے پاس تھے وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں لٹ گئے۔

اسی طرح مخطوطہ نمبر ۱۰۱۲۔ دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن کی نقل ہے۔ غالب کے دیوان کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۶۳ / ۱۸۴۷ میں مطبع دار السلام حوض قاضی دہلی میں چھپا تھا۔ یہ نسخہ بھی اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا۔ اس کا نسخہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور او رایک نسخہ صولت پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ صولت لائبریری کے نسخے کا عکس رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

مخطوطہ نمبر ۱۴۲۲۔ یہ نسخہ شیرانی کا اوٹوگراف ہے۔ اصل نسخہ پروفیسر محمود خاں شیرانی کی ملکیت تھا جو اَب پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ نسخہ شیرانی کا سنہ کتابت ۱۸۲۶ ہے اور تاریخی ترتیب سے یہ تیسرا سب سے قدیم نسخہ ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا غلط نہ ہوگا کہ سب سے قدیم نسخہ مکتوب ۱۸۱۶ ہے جو نسخہ عرشی زادہ اور نسخہ امروہہ سے معروف ہے اس کا عکس کمال احمد صدیقی صاحب کی کتاب میں بھی شائع ہوا ہے۔ دوسرا سب سے قدیم نسخہ ۱۸۲۱ء کا نسخہ حمیدیہ یا نسخہ بھوپال ہے۔ نسخہ مکتوبہ ۱۸۱۶ء کی دریافت سے قبل یہ سب سے قدیم سمجھا جاتا تھا۔ بقول مولانا عرشی آزادی کے بعد یہ نسخہ کتب خانہ حمیدیہ سے غایب ہوگیا ہے۔ مجھے اب تک اس کے عکس دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ تیسرا سب سے قدیم نسخہ نسخہ شیرانی ہے جس کا اوٹوگراف ہماری لائبریری میں محفوظ ہے۔ مخطوطہ نمبر ۱۴۲۳ یہ نسخہ لاہور کا عکس ہے۔ ابھی حال ہی میں پروفیسر گیان چند نے اس کے بارے میں لائبریری کو ایک خط لکھا تھا ان کی اطلاع کے مطابق یہ اوٹوگراف قاضی عبدالودود صاحب نے لائبریری کو مہیا کردیا تھا۔

جس کی مدد سے مولانا عرشی صاحب نے نسخہ عرشی مرتب کیا تھا ان کے ایک دوسرے خط کے مطابق یہ نسخہ بھی چوری ہو چکا ہے۔

غالب کی اصلاحیں: غالب سے متعلق لائبریری میں جو ذخیرہ ہے اس کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ بہت سے مخطوطات اور مطبوعات پر مرزا غالب کے قلم کی اصلاحیں ہیں جو غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اہم ہیں۔ مثلاً دیوان غالب، مکتوبہ ۱۸۵۵ء جسے غالب نے نواب یوسف علی خاں کو پیش کیا تھا۔ اس پر جا بجا غالب کی اصلاحیں ہیں اسی طرح انتخاب غالب جسے غالب نے نواب کلب علی خان کو ۱۸۶۶ میں بھیجا تھا۔ اس پر بھی غالب کی اصلاحیں ہیں اس کے علاوہ دیوان نواب یوسف علی خان ناظم کے کلام پر غالب کی اصلاحیں ہیں۔ ان کے ایک شعر 'بے دیئے لے اڑا کبوتر خط' پر غالب کے ہاتھ کا یہ نوٹ درج ہے:

> اگر بن دیئے کہنا منظور نہیں تو بے دِی رہنے دیجئے لیکن میرے نزدیک بن دیئے فصیح ہے۔ چنانچہ میرا شعر ہے: میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبہ دل۔ اوس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے۔ اس سے قطع نظر یہ جو مثل مشہور زبان زد مشہور ہے کہ بن آئے کوئی نہیں مرتا۔ اس کو کوئی کیا کرے گا۔ غرضیکہ میں اپنی طرف سے اس لفظ کی سفارش کرتا ہوں۔ مگر آپ کی اطاعت منظور ہے ایک بار عرض کر کے پھر نہ کہوں گا۔ غالب ۱۲۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کے چچازاد بھائی صاجزادہ سید عباس علی خاں مخلص بیتاب کے دیوان پر غالب کی اصلاحیں ہیں یہ دیوان گلدستہ باغ ضبان کے نام شائع ہو چکا ہے۔ غالب ان کے کلام کی اصلاح کے سلسلے میں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

قبلہ جس شعر پر صاد ہے وہ بہت خوب ہے اور جس کو کاٹ دیا وہ معیوب ہے اور

جس پر صاد نہیں وہ بے عیب اور ہموار اور جس کے معنی میں مجھے تامل ہے اوس پر نظر علامت اوس کی نظر۔ باقی جا بجا منشاء اصلاح اور حقیقت الفاظ لکھ دی۔ تین جز جس میں سات ورق سادے ہیں پہنچتے ہیں اور اجزاء بھیج دیجئے۔ (مکاتیب ۸۸)

نظام رامپوری کے دیوان پر جو غالب کی اصلاحیں ہیں اس کا عکس شبیر علی خاں شکیب نے اپنی کتاب رام پور کا دبستان شاعری میں کیا ہے۔

رضا لائبریری میں ریاست لوہارو سے کتابوں کا جو نایاب ذخیرہ آیا اس میں غالب سے متعلق نہایت اہم مواد ہے۔ خاص طور پر برہان قاطع کا وہ نسخہ قابل ذکر ہے جس پر غالب نے اپنی یادداشتیں قلم بند کی تھیں اور جو برہان قاطع کا سبب بنا تھا۔ کتاب قاطع برہان غالب نے اس زمانے میں لکھی تھی جبکہ غدر کے بعد ہر طرف خاموشی اور اداسی کا عالم تھا اور وقت گزارنے کے لیے انہوں نے محمد حسین تبریزی کی کتاب برہان قاطع کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کتاب پر انہیں بے شمار غلطیاں نظر آئیں جسے انہوں نے نوٹ کیا اور اسے برہان قاطع کے نام سے ۱۸۶۲ میں مطبع نولکشور سے شائع کرایا۔ اپنے ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں۔ اس درماندگی میں چھاپے کی برہان قاطع میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط ہزارہا بیاض لغو، عبارت پوچ، اشارات پادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور قاطع برہان اس کا نام رکھا ہے۔

برہان قاطع کے علاوہ اس ذخیرہ میں دیوان کلیات غالب فارسی قلمی کے دو نسخے ہیں جن پر غالب کی اصلاحیں اور یادداشتیں موجود ہیں۔ لغت کی ایک اچھی کتاب مصطلحات الشعرا پر غالب کے نوٹ ہیں۔ رضا لائبریری میں غالبیات کا جو ذخیرہ ہے اس کی ایک اور خاص اہمیت یہ ہے کہ غالب کی کتابیں جو ان کی زندگی میں لکھی گئیں یا مختلف ایڈیشنز کے ساتھ شائع ہوئی تھیں اس میں سے زیادہ تر کتابیں یہاں موجود ہیں۔

آخر میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا لائبریری کے ذخیرہ غالبیات پر مولانا عرشی

نے اتنا زیادہ لکھا ہے کہ اب مزید کچھ لکھنے کی گنجائش نہیں ہے اس سلسلے میں نیاز فتحپوری نے نہایت دلچسپ بات کہی ہے۔

مولانا عرشی عرصہ سے غالب کے
پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور معلوم ایسا ہوتا ہے
کہ وہ اس کا نام مٹائے بغیر نہ رہیں گے کسی
شخص کے متعلق اتنا کچھ لکھنا کہ پھر کچھ لکھنے کو
باقی ہی نہ ہے اس کا نام ہی مٹانا ہے۔

نیاز (نگار لکھنوی ۱۹۴۳)

حوالے:

۱۔ غالب اور مطالعہ غالب۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، سکینہ پبلشنگ ہاؤس، دلی ۱۹۷۰
۲۔ بیاض غالب تحقیقی جائزہ، کمال احمد صدیقی، ادارہ مطالعات غالب سرینگر، کشمیر
۳۔ خاندان لوہارو کے شعرا، حمیدہ سلطان احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۱
۴۔ دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے، کالی داس گپتا رضا، ساکار پبلشرز، ممبئی۔ ۱۹۸۸
۵۔ دیوان غالب، نسخہ عرشی نقش ثانی مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۲
۶۔ مکاتیب غالب، مولانا عرشی

شمس بدایونی

دیوانِ غالب کا ایک مستور رامپوری نسخہ

دیوانِ غالب کے ان قلمی نسخوں میں سے جن سے غالب کے اردو دیوان کی تدوین میں مدد لی گئی دو اہم نسخوں کا تعلق ریاستِ رامپور کے کتب خانے سے ہے۔ میری مراد نسخۂ رام پور قدیم ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) اور نسخہ رامپور جدید ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) سے ہے۔ یوں تو آج اس کتب خانے میں دیوانِ غالب اردو کے ۶ قلمی نسخے، ایک انتخاب اور ۲ قلمی نسخوں کی عکسی کاپیاں محفوظ ہیں[1]۔ لیکن سوائے متذکرہ بالا نسخوں اور انتخاب کے باقی غیر اہم ہیں۔

ان نسخوں کے علاوہ رامپور میں ایک قلمی نسخہ اور بھی تھا جو ماہرین غالبیات اور اردو محققین کے ہاتھ نہیں لگ سکا لیکن جس کے وجود کو محققین تسلیم کرتے ہیں اور اسی تسلیم و رضا کے ماحول میں اُس کی نسبت رامپور کی طرف کرتے ہوئے، غالب کے دیوانِ اردو کے دیباچہ کی تاریخ ۲۴ رذی قعدہ ۱۲۴۸ھ/۱۶ راپریل ۱۸۳۳ء کا تعین کرتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ میں غالب نے دیوان ریختہ ترتیب دے دیا تھا۔ لیکن تقریظ لکھنے میں تاخیر اور بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں پہلی بار دہلی

کے مطبع سید الاخبار میں چھپا۔ بعض محققین اِس تاریخ کو دیباچہ کا سالِ تصنیف مانتے ہیں اور اکثر دیوان اردو کا سنہ ترتیب (کتابت۔ عرشی صاحب مؤخر الذکر کے حامی ہیں اور اسی بنیاد پر وہ نسخہ رامپور قدیم کو بھی ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) کا مکتوبہ مانتے ہیں۔ ذیل میں اسی مستور رامپوری نسخے پر چند معروضات پیش کیے جا رہے ہیں۔

مذکورہ بالا رامپوری نسخہ سے سب سے پہلے نظام الدین حسین نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) نے استفادہ کیا۔ انہوں نے نظامی پریس بدایونی سے شائع ہونے والے دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۱۸ء) کی ترتیب کے وقت پہلے ایڈیشن کے متن کا مقابلہ اسی رامپوری نسخے سے کیا۔ خیال رہے نظامی پریس بدایونی سے دیوان غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا، جو غالب کی زندگی میں شائع ہونے والے دیوان اردو کے تیسرے اڈیشن مطبوعہ مطبع احمدی دہلی ۱۲۸۷ھ/۱۸۶۱ء کے مطابق تھا۔ یہ نسخہ چونکہ کتابت کی اغلاط سے پُر تھا لہٰذا نظامی نے صحتِ متن کا خیال رکھتے ہوئے پہلے ایڈیشن کو غالب کے مطبوعہ دواوین، شرح جات اور حافظے سے درست کر لیا لیکن دوسرا ایڈیشن ترتیب دیتے وقت انہوں نے غالب کے کسی قلمی نسخے کو پیش نظر رکھنا ضروری خیال کیا۔ چناں چہ انہوں نے اس کے لیے سعی کی۔ وہ طبع دوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> اس مرتبہ اس سے بھی پرانا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اصل دیوان سے نقل کیا گیا ہے جس کو پہلی مرتبہ غالب نے ۱۲۴۸ھ میں مرتب کیا تھا۔ یہ نقل جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔ اُسی کے ساتھ ایک دیباچہ بہ زبان فارسی مصنف نے لکھا ہے جس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوانِ اردو، فارسی دیوان سے پہلے مصنف نے ۱۲۴۸ھ میں ترتیب دیا تھا۔ لیکن اس میں مصنف کی بعض مشہور غزلیں نہیں

ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۸ھ کے بعد دوسرا نسخہ مرزا نے
اُن غزلیات کو شامل کر کے جو سال مذکور کے بعد تصنیف ہوئیں،
ترتیب دیا ہے اور وہی اب تک رائج ہے۔ اگر اُس قلمی نسخے کی
جو ۱۲۴۸ھ کا لکھا ہوا ہمیں ملا ہے متابعت کی جائے تو بعض مشہور
غزلیں نکال دینی پڑیں گی۔ مثلاً یہ غزل ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور

جس کا مضمون تاریخی واقعہ پر مشتمل ہے اور یقیناً غالب کی مصنفہ ہے۔ اسی لیے اُس قلمی دیوان سے صرف یہ مدد لی گئی ہے کہ بعض خفیف غلطیاں جو مطبوعہ دیوانوں میں پائی گئیں، درست کر لی گئیں ہیں۔

نظامی کا منشاء غالب کے دیوان کا تحقیقی متن پیش کرنا نہیں تھا۔ بلکہ مطبوعہ ایڈیشنوں میں جو مختلف متن نظر آتا تھا یا کتابت وطباعت کے سبب لفظ کچھ سے کچھ ہو گئے تھے، اُن کو درست کرنا تھا اور اُن کا قابل قبول متن اور صحیح قرأت پیش کرنا تھا۔ چناں چہ نظامی نے اس نسخے سے بعض لفظی غلطیاں درست کیں۔ اشعار کی ترتیب اور ان کی تعداد سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ دیباچہ مع تاریخ (بست وچہارم شہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ) درج کیا۔ باقی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

رامپوری نسخے کا دوسری مرتبہ ذکر امتیاز علی خاں عرشی (ف ۱۹۸۱ء) کے مضمون 'نسخہ بدایوں' کے تعارف میں آیا۔ اُس میں انہوں نے لکھا[۵]۔

> سب سے پہلے آپ (نظامی) ہی نے غالب کے اردو دیوان کے فارسی دیباچے کی تاریخ ایک رام پوری نسخے کی مدد سے (جو احمد علی شوق قدوائی مرحوم کے پاس تھے) ۱۲۴۸ھ متعین کی۔ باردگر دیوان غالب (نسخۂ عرشی) میں اس نسخہ کا ذکر بایں الفاظ

درج کیا گیا۔

مولانا نظامی بدایونی نے ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۲ء) کے ایڈیشن[۶] میں رامپور کے قلمی نسخے دیوان غالب سے جو منشی احمد علی شوق قدوائی کے پاس تھا اور اب خدا جانے کہاں ہے مقابلہ کر کے زیادہ صحیح متن پیش کیا۔ مذکورہ بیانات سے حسب ذیل نتائج برآمد کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ نسخہ رامپور قدیم اور نسخہ رامپور جدید کے علاوہ رامپور میں ایک اہم قلمی نسخہ اور بھی موجود تھا جو کئی اعتبار سے قابل مطالعہ و استفادہ تھا۔

۲۔ یہ نسخہ احمد علی شوق قدوائی کے پاس تھا۔ خواہ یہ ان کا اپنا ہو یا کہیں سے مستعار لیا گیا ہو۔

۳۔ نظامی کے مطالعے میں آنے کے بعد یہ نسخہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور جب اہل قلم نظامی کے بدایونی ایڈیشن میں اس کا ذکر پڑھ کر اِس کی طرف متوجہ ہوئے تب یہ شوق کی وفات (۱۹۲۵ء) کے سبب دوبارہ دیکھنے میں نہیں آ سکا۔

۴۔ نظامی نے اُس نسخے سے خاطر خواہ استفادہ کیا لیکن ملکیت نسخہ کی بابت یا تو وہ ناواقف رہے یا اُس کے بارے میں کچھ لکھنا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا۔

ذیل میں ان نتائج کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۱۔ رامپوری نسخہ کی موجودگی کی اطلاع دینے والے پہلے شخص نظامی بدایونی ہیں۔ نظامی کی اطلاع سے قبل اردو والے اِس نسخہ کے وجود سے ناواقف تھے۔ اِس نسخہ کے وجود کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ عام طور پر بعد کے محققین نے نظامی کی اطلاع کو مستحق مان لیا اور اُسی کو دہراتے ہوئے اپنی بات کہی۔ عرشی صاحب جو خود برسوں رامپور میں اِسی کتب خانہ کے ناظم رہے انہوں نے اپنی کسی دوسری تحریر میں کہیں بھی اس نسخے کی حقیقت جاننے، اس کے وجود اور نوعیت نسخہ کو موضوع گفتگو بنانے، اس کو تلاش کرنے، شوق کی تصنیفات میں اس کے اشارے دریافت کرنے، ان کے پس ماندگان سے اس کے

متعلق استفسار کرنے جیسا کوئی عمل میرے علم و اطلاع میں نہیں کیا۔ نظامی کے بیان کو بغیر کسی جرح و تعویل کے قبول کر لیا۔ عرشی صاحب کی طرح بعد میں دوسرے محققین، کالیداس گپتا رضا، مالک رام، گیان چند جین وغیرہ نے بھی نظامی کے بیان کو بغیر کسی بحث کے قبول کر لیا۔

۲۔ یہ نسخہ احمد علی شوق کے پاس تھا یا ان کی کوشش سے دیکھا گیا تھا اس کا ذکر نظامی نے اپنے دیباچے میں نہیں کیا۔ (دیباچہ کی عبارت اوپر نقل کی جا چکی ہے) اس کا علم کیسے ہوا کہ یہ نسخہ شوق کے پاس تھا۔ اس سلسلے میں بھی نظامی بدایونی ہی کا ایک مکتوب ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ نظامی نے یہ مکتوب سر اکبر حیدری (ف ۱۹۴۵ء) کے ایک استفسار کے جواب میں ۳ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو لکھا تھا۔ سر اکبر حیدری کے استفسار کا پس منظر ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنی کتاب ''غالب میں درج کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: جن دنوں ڈاکٹر عبداللطیف اردو دیوان غالب تاریخی ترتیب کے ساتھ مدوّن کر رہے تھے انکے لیے سر اکبر حیدری نے مفید عام اسٹیم پریس آگرہ (۱۹۲۱ء) کے مطبوعہ، نسخہ حمیدیہ کی ایک جلد اپنے خط کے ساتھ نظامی کو ارسال کی اور ان سے گزارش کی کہ وہ ڈاکٹر عبداللطیف کے کام میں تعاون کی غرض سے رامپوری نسخہ کو پیش نظر رکھ کر نسخہ حمیدیہ کے ان اشعار اور غزلوں پر نشان لگا دیں جو رامپوری نسخہ میں موجود نہیں ہیں اور ان لوگوں کے نام سے بھی مطلع فرمائیں جو ان دونوں نسخوں کا مقابلہ کر کے متعلقہ اشعار کو نشان زد کریں۔ نظامی نے نسخہ حمیدہ کی جلد رامپوری نسخہ کی عدم موجودگی کی معذرت کے ساتھ واپس کر دی۔ البتہ جب نسخہ حمیدیہ حیدر آباد پہنچا۔ تو اس میں کئی اشعار اور بعض جگہ مصرعے سرخ پنسل سے نمایاں طور پر نشان زدہ تھے۔ جس سے ردیف الف کی غزلوں میں ڈاکٹر عبداللطیف کی تاریخی ترتیب کی تائید و تصدیق ہوتی تھی۔ نظامی نے خط میں لکھا کہ ''کتاب ''نسخہ حمیدہ'') کو بکستبہ واپس کرنا پڑا پھر یہ نشان کس نے لگائے؟ نظامی کے خط کا مکمل متن درج کرنا درست ہوگا ؂۔

نظامی پریس۔ بدایونی۔ یوپی　　　ایڈیٹر ذوالقرنین

۳؍دسمبر ۱۹۲۷ء

مکرم ومحترم بندہ　　تسلیم

مجھے ندامت ہے کہ میں تعمیل ارشاد نہ کرسکا۔ اور کتاب کو بجنسہ واپسی کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلمی دیوان جو ۱۲۴۸ھ کے قریب کا لکھا ہوا مجھے ۱۹۱۸ء میں ملا تھا اور جس کا ذکر میں نے اپنے یہاں کے مطبوعہ دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن میں کیا ہے وہ اس وقت میرے پاس موجود نہ تھا بلکہ ایک مرحوم دوست (منشی احمد علی شوق) کے ذریعے سے مجھے رامپور میں دستیاب ہوا تھا۔ جس سے میں نے اُس وقت کام لیا تھا۔ میں نے ۷؍نومبر کو جو عریضہ بھیجا تھا اور جس میں میں نے تحریر کیا تھا کہ اِس کام کے لیے وقت کی ضرورت ہے اُس وقت مجھے خیال تھا بلکہ امید تھی کہ رامپور میں یہ نسخہ مل جائے گا اور اس سے میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کرسکوں گا۔ چناں چہ میں ۱۷؍نومبر کو رامپور گیا اور وہاں ۲۰؍نومبر تک مقام کیا (کذا) اور اس درمیان مین ہر امکانی کوشش نسخہ مذکور کے لیے کی لیکن کامیابی نہ ہوئی، کتب خانہ رامپور میں بھی یہ نسخہ موجود نہیں بلکہ وہاں ایک نسخہ قلمی ضرور ہے جو ۱۸۵۵ (۱۲۷۱ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ مجھے خیال تھا کہ منشی احمد علی صاحب شوق نے جن کا تعلق کتب خانہ سرکار رامپور سے تھا مجھے یہ نسخہ (۱۲۴۸ھ) کتب خانہ مذکور سے لے کر دیا ہوگا لیکن وہاں نہ ملا۔ اب منشی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے میں اس کے حصول سے مجبور رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسخہ ان کا ذاتی تھا یا کسی دوست سے لے کر مجھے دکھایا تھا۔ والسلام

نیازمند

نظامی بدایونی عفی عنہ

ڈاکٹر سید عبداللطیف کے بیان کردہ پس منظر اور نظامی کے اصل خط کے مطالعہ کے بعد بعض امور توجہ طلب بن جاتے ہیں۔

ا۔ قلمی نسخے کی موجودگی ہر لکھنے پڑھنے والے کو پہلے اس بات کے جاننے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ نسخہ کس کا ہے اور کہاں سے آیا اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نظامؔی نے اسے سرکاری کتب خانہ کا نسخہ خیال کیا تھا تو اس کتب خانے میں دو اہم نسخے اور بھی تھے۔ نظامؔی نے ان سے مقابلہ کیوں نہیں کیا۔ جبکہ تیسرا ایڈیشن (۱۹۲۰ء) ترتیب دیتے وقت نظامؔی کے پیش نظر نسخہ رامپور جدید رہا جو ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء کا مکتوبہ ہے۔

نظامی ریاست رامپور کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ دیوانِ غالب طبع دوم (۱۹۱۸ء) کے ٹھیک ایک سال بعد انہوں نے کارنامہ رامپور کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں ریاست رامپور کے فرمانرواؤں کا تعارف کراتے ہوئے نواب حامد علی خاں کی علم دوستی، عدل گستری وغیرہ کا بیان کیا تھا یہ کتاب نواب حامد علی خاں کی چوالیسویں سالگرہ (۱۹۱۹) کے موقع پر ان کی نذر کی گئی تھی۔ لہٰذا نواب رامپور اور ان کی ریاست کے کتب خانے تک رسائی کے وسائل اُن کے پاس موجود تھے اور اس سے انہوں نے نجی زندگی میں فائدہ بھی اٹھایا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ احمد علی شوقؔ ان کے دوست تھے۔ شوق اوائل عمر میں بدایوں میں شعر و شاعری کا چرچا دیکھ کر شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ وہ ان دنوں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں درجہ دہم کے طالب علم تھے۔ بدایوں کے ایک عالم مولوی یعقوب بخش راغب بدایونی (ف ۱۹۴۸ء) کو شاعری میں ان سے تلمذ تھا لہٰذا شوقؔ اور نظامؔی کی ذاتی قربت کے بھی متعدد قرینے موجود ہیں۔ اس صورت میں غالب جیسے عظیم شاعر کے قلمی نسخے کی ملکیت کے بارے میں نظامی کا ناواقف محض ہونا عجیب سا لگتا ہے؟

۲۔ رامپوری نسخہ شوق کے پاس ان دنوں دیکھا گیا جب وہ رامپور میں نواب حامد علی خاں (ف ۱۹۳۰ء) کے مصاحب کی حیثیت سے موجود تھے اور فرہنگ حامدیہ کی تدوین میں مددگار تھے۔ اس فرہنگ کی ۷ مجلدات و ۳۰ حصص (۱۹۰۸ تا ۱۹۲۶ء) رضا لائبریری میں موجود ہیں۔ جن پر مرتب کی حیثیت سے منشی احمد علی شوق قدوائی و عبدالمجید خاں رامپوری

کے نام کا اندراج ملتا ہے۔[۸] قرائن کہتے ہیں کہ شوق قدوائی کا رامپور سے تعلق ۱۹۱۴ء کے آس پاس قائم ہوا اور وفات (۱۹۲۵) سے دو سال قبل یعنی ۱۹۲۳ء کے آس پاس نواب حامد علی خاں کی ان کے بھتیجے صفدر قدوائی سے کسی سبب ناراضگی رام پور چھوڑ دینے کا سبب بنی چناں چہ شوق سترِکھ (ضلع بارہ بنکی) میں اپنے گھر میں گوشہ نشین ہوگئے اور وہیں ۲۷/اپریل ۱۹۲۵ء کو وفات پائی۔[۹] لہٰذا اگر یہ نسخہ شوق کا ذاتی ہوتا تو وہ اُس کو لائبریری میں داخل کر سکتے تھے قیمتاً یا تحفتاً۔ علاوہ ازیں اس نسخے کے وجود کا اعلان کر کے بھی علمی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ نظامی نے ''دیوان غالب'' کے دیباچہ میں شوق کے نام کا اعلان نہیں کیا۔ بعد از وفاتِ شوق ایک مکتوب میں ان کے نام کا اظہار فرمایا۔ یہ مکتوب بھی اگر شائع نہ ہوتا تو اس نسخہ کی ملکیت کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا۔ لہٰذا نظامی کا دیباچہ اور نظامی کا خط دونوں اس نسخے کے بارے میں کچھ پردہ پوشی کرتے نظر آتے ہیں۔ خواہ یہ پردہ شوق کے شرطِ استفادہ کے تحت ہو، یا نظامی کی اپنی کوئی مصلحت ہو؟ واللہ اعلم بالصواب۔

عبداللطیف نے لکھا ہے کہ جب نسخہ حمیدیہ ان کو واپس ملا، تو اس پر نشان لگے تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نظامی رامپوری نسخہ کی موجودگی سے انکار کر رہے ہیں تو نسخہ حمیدیہ پر نشان کس چیز کو بنیاد بنا کر لگائے گئے۔ اس کی تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ نظامی کا اپنا مسودہ جس کا مقابلہ زیرِ بحث رامپوری نسخے سے کیا گیا تھا بنیاد بن گیا ہو۔ لیکن اگر نظامی نے ایسا نہیں کیا تھا تو اس کے اظہار میں کیا قباحت تھی۔ عبداللطیف کو یہ نشان ''الہامی چیز معلوم نہ ہوتے''۔ غالب، ص ۱۳۶

اِس نسخہ کی ملکیت کے بارے میں محققین کے بیانات متضاد ہیں۔ چونکہ اِس نسخے کو شوق کی وفات کے ساتھ مرحوم تصور کر لیا گیا لہٰذا اِس پر گفتگو کے دروازے کھلے ہی نہیں موجودہ صورت میں اِسے:

نسخہ رامپور یا رامپوری نسخہ کہنا صحیح ہوگا۔ یا
شوق کا شخصی نسخہ یا کسی تیسرے فرد کا ذاتی نسخہ۔

اِس نسخہ کی ملکیت اور موجودگی کے بارے میں نظامی کے بیانات مرموز ہیں۔ ان پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ حرف آخر کے طور پر ڈاکٹر عبداللطیف کے اس بیان کا اعادہ آج بھی بے محل نہ ہوگا[۱۱] کہ کلام غالب کے محققین ان معلومات کی روشنی میں اس نسخہ کی تلاش کر سکتے ہیں۔ اس کی دستیابی سے مطالعہ غالب کے کئی مسائل کے حل میں مدد ملے گی۔

یہ مضمون سپرد قلم کیا جاچکا تھا کہ عرشی صاحب کا یہ نوٹ نظر سے گزرا[۱۲]:

یہ قابل ذکر ہے کہ تاریخ دیباچہ کے سلسلے میں شیخ محمد اکرام صاحب غالب نامہ نے کتاب خانہ رامپور کے قلمی نسخے کا حوالہ دیا ہے۔ مگر یہاں ایسا کوئی نسخہ موجود نہیں جس میں تاریخ و تالیف کا ذکر ہو۔ غالباً انہوں نے شوق قدوائی ہی کے مخطوطے کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ اور چونکہ شوق عرصے تک رامپور میں مقیم رہے تھے اس لیے یقین کر لیا ہوگا کہ تاریخ والا نسخہ رامپور میں ہے۔

عرشی صاحب نے ''غالب نامہ'' کا صفحہ نمبر اور سال اشاعت درج نہیں کیا۔ راقم الحروف کے پیش نظر طبع چہارم (مطبوعہ تاج آفس، بمبئی سنہ اشاعت ندارد و قیاساً ۱۹۴۹ سے ۱۹۵۰ کے درمیان) ہے۔ اس میں صفحہ ۲۱۹ پر درج ہے:

اِس کے علاوہ جب انہوں نے ۱۲۴۸ ہجری میں؟) منتخب اردو
دیوان اشاعت کے لیے مرتب کیا تو پرانی غزلوں کے تتمے لکھے
اور بعض دوسرے اشعار کا اضافہ بھی کیا۔

اس عبارت میں بریکٹ میں سنہ ۱۲۴۸ھ کا لکھنا اور اس کے آگے سوالیہ نشان (Sing of Interrgation) کا لگانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سنہ کے سلسلہ میں شیخ اکرام مطمئن نہیں تھے۔ اگر ان کی نظر سے اس کا قلمی نسخہ گزرا ہوتا تو اس سنہ پر مطمئن نہ ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ دراصل شیخ اکرام نے بھی نظامی کی پیش کردہ معلومات پر حصر کیا لیکن اس کا حوالہ

نہیں دیا۔

غالب نامہ کا دوسرا حصہ "ارمغان غالب" سردست میرے پیش نظر نہیں اس میں شیخ اکرام نے رامپوری نسخے کا حوالہ دیا ہے یا نہیں اس سلسلے میں کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔

مراجع و ماخذ:

۱۔ادبی زائچے، ویریندر پرشاد سکسینہ، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بدایوں، ۱۹۸۵ء

۲۔دیوان غالب (طبع ششم) نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۷ء

۳۔دیوان غالب، امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی باردوم ۱۹۸۲ء

۴۔دیوان غالب، کالی داس گپتا رضا، ساکار پبلشرز، بمبئی بارسوم ۱۹۹۵ء

۵۔غالب (اردو) عبداللطیف، دکن لا رلورٹ پریس، حیدر آباد ۱۹۳۲ء

۶۔غالب اور عصر غالب، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، غضنفر اکادمی، کراچی، ۱۹۸۲ء

۷۔نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات، ڈاکٹر شمس بدایونی، نامی آفسیٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۵ء

۸۔رضا لائبریری جرنل، مدیر وقار الحسن صدیقی، رضا لائبریری، رامپور شمارہ ۲، ۱۹۹۵

فٹ نوٹ:

۱۔فہرست مخطوطات اردو، رضا لائبریری از شعائر اللہ خاں وجہی، مشمولہ رضا لائبریری جرنل، ص ۳۸۳

۲۔دیباچہ دیوان غالب، ص ۶۱، ۶۲

۳۔یہ غزل دراصل مرزا زین العابدین خاں عارف (ف اپریل ۱۸۵۲ء) کا مرثیہ ہے۔

۴۔نقوش لاہور، جون ۱۹۶۰ء، بحوالہ غالب اور عصر غالب، ص ۱۹۴

۵۔دیوان غالب، طبع دوم، ص ۴۷

۶۔عرشی مرحوم کو التباس ہوا یہ دراصل طبع دوم یعنی ۱۹۱۸ کا ایڈیشن ہے۔

۷۔غالب، ص: ۱۳۴ تا ۱۳۶

۸۔فہرست مخطوطات اردو، رضا لائبریری جرنل، ص ۳۵۶

۹۔ادبی زائچے۔ ص ۴۰

حکیم محمد حسین خاں شفا

اہلِ رامپور سے غالب کے ادبی، طبّی و سیاسی روابط

غالب ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں شہرت عام اور بقائے دوام سے ہمکنار ہوئے اور دہلوی کہلائے۔ لکھنؤ، لوہارو، بنارس، کلکتہ الغرض ہندوستان کے بہت سے شہروں کی سیاحت کی۔ لیکن کچھ خصوصی روابط اور چند ماہ کے قیام سے اُن کو جو تعلق خاطر اہل رامپور شہر یا رام پور سے پیدا ہو گیا تھا وہ ہندوستان کے کسی خطے کو حاصل نہیں ہوا۔ غالب نے اردو فارسی نظم ونثر میں جو خراج عقیدت رام پور کو پیش کیا وہ قابلِ غور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

رام پور اہل نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم

رام پور آج ہے وہ بقعہ معمور کہ ہے
مرجع و مجمع اشراف نژاد عالم

رامپور ایک بڑا باغ ہے ازروئے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرم

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اسی طور پہ یاں جلوہ فشاں دست کرم

ابر دستِ کرم کلب علی خاں سے مدام
در شہوار ہیں جو گرتے ہیں قطرے پیہم

صبح دم باغ میں آجائے جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگ و گل لالہ پہ دیکھے شبنم

خَبْذا باغ ہمایوں تقدس آثار
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالان حرم

مسلک شرع کے ہیں راہ رو راہ شناس
خضر بھی یاں اگر آجائے تو لے ان کے قدم

مدح کے بعد دعا چاہیے اور اہل سخن
اسکو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم

حق سے کیا مانگئے ان کے لیے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و فیل وسپہ و کوس و علم

ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل
وہ دعائیں ہیں کہ جو وہ دیتے ہیں نواب کو ہم

یا خدا غالب عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلب گار ہے جن کا عالم

اولاً عمر طبعی بہ دوام اقبال!
ثانیاً دولت دیدار شہنشاہ اُمم

غالب کی شناسائی کچھ صاحبزادگان رام پور سے ابتدائے شباب سے تھی جو اُن کے ہم مشرب بھی تھے اور ہم مذاق اور شریکِ کار بھی۔ دہلی میں غالب کی قیام گاہ کو کلب کی حیثیت حاصل تھی جہاں عرق خانہ ساز و ولایتی کشید کر کے پینے پلانے کے ساتھ ساتھ قلندرانہ لین دین بھی ہو جاتا تھا جو دہلی کے بے فکرے رئیس زادوں اور چاندانی چوک کے بعض جوہری بچّوں کے وقت گزارنے کا مشغلہ تھا۔ اس میں کئی مرتبہ حکّام وقت کی مداخلت سے بے لطفی بھی پیدا ہوگئی جب غالب نے علمی شہرت حاصل کی اور گھر پر دوست احباب کے بچّوں کو پڑھانے لگے، اسی کے ساتھ ساتھ اصلاح سخن کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تو بہت سے رام پوری شعرا اور رؤسا کے بچّے اُن کے شاگرد ہو گئے جن میں نواب یوسف علی خاں ناظم بھی شامل تھے۔ غالب اُن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور میرے آشنائے قدیم ہیں۔ اس سال میرے شاگرد ہوئے، ناظم تخلص دیا گیا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا ہے۔ زندگی کا دارومدار اُن کے عطیے پر ہے۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

غالب دو مرتبہ رام پور آئے۔ پہلی مرتبہ ۲ر جنوری ۱۸۰۶ء کو نواب یوسف علی خاں کی دعوت پر

اور دوسری مرتبہ ۱۶/ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو نواب کلب علی خاں کی تخت نشینی اور نواب یوسف علی خاں کی تعزیت کے سلسلے میں۔ غالب رام پور تشریف لے آئے تو ان کے ایک دوست نے پتہ دریافت کیا تو جواب میں لکھتے ہیں:

یہ تو بتاؤ رام پور میں مجھے کون نہیں جانتا۔ چار دن والی شہر نے اپنی کوٹھی "خورشید منزل" میں اُتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں مجھ کو برابر عطا ہوگئیں۔ اب اس میں رہتا ہوں۔ عجب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دہلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رام پور کا نام اور میرا نام۔ محلّے اور عرف کی حاجت نہیں۔

انہوں نے رامپور سے اپنے دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں رام پور کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

یہ رام پور ہے دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔

پانی.... سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر دریا ہے اور کوسی اسی کا نام ہے بے شبہ چشمہ آبِ حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے۔ اتنا شیریں کہاں ہوگا۔ اتنا میٹھا ہے کہ پینے والا گمان کرتا ہے کہ یہ میٹھا شربت ہے۔ سبک گوارا ہاضم سریع النفوذ اس کو پی کر قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو خوب بھوک لگتی ہے لڑکے بھی تندرست آدمی بھی توانا۔

..... خدا کی قسم میں یہاں پر تندرست و خوش ہوں۔ دن کا کھانا

ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھتے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، تنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے اَچار، میں بھی خوش لڑکے بھی خوش اس بقعہ نور سراسر سرور میں غالب مغموم بہت مسرور ہے۔ اور کیوں نہ ہو فقیر کی قدر و منزلت کیا اہالی شہر اور کیا والیٔ شہر ہر دو جانب سے ارزش سے بڑھ کر ہے.....

یہاں کا ارمغان اہل شہر کی کشش سیرت و صورت اور روش خلوص و مروّت ہے یا نواب عالی جناب معلّٰی القاب کا دیدار پرانوار اور گل افشانی گفتار ہے۔

شہر کا یہ حال ہے کہ ذوق شعر گوئی اور شعر فہمی کا جو پایا میں نے یہاں پایا۔ جمیع اہل ہند کو بھی میسّر نہ آیا۔ رام پور کہاں اس باب میں روحِ کش رش شیراز و اصفہان ہے۔ ہر شخص شعر کا فریفتہ، شعر ہر شخص پر فریفتہ، شہر یار کا یہ حال ہے کہ سچ عرض کرتا ہوں نواب صاحب کو پروردگار نے جیسا حسن تناسب اعضاء و اندام دیا ہے ویسا ہی حسن تخیل اور اعجاز کلام دیا ہے۔ چند روز ہوئے بیاض معروف کے اوراق برائے اصلاح مرحمت فرمائے۔ لیکن اس سحر حلال کو کوئی کیا ہاتھ لگائے۔ دعا گو کہتا ہے کہ خدا اسے نظر بد سے بچائے۔

اس خط میں ولی عہد ریاست کلب علی خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اور سنو تعجب کرو گے کے فرزند دلبند بھی نواب صاحب کو اخلاق

پسندیدہ اور اوصافِ حمیدہ کا مالک ملا ہے خوش گفتار، صاحب
کردار۔"

۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور فرزند دلبند نواب ہوئے۔
غالبؔ مبارک باد دینے رام پور آئے۔ تحریر فرماتے ہیں:

نواب صاحب حال بمقتضائے الولد ینھلا بیہ حسنِ اخلاق
میں نواب فردوس آرام گاہ کے برابر بلکہ بعض شیوۂ روش میں اُن
سے بہتر ہیں۔

غالب کو بھی نواب صاحب نے ۱۲ سو روپے نذر کیے۔ اپنے ایک اور خط میں نواب کلب علی
خاں کے بارے میں لکھتے ہیں:

۔سنو اب میں۔۔رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد، رنگ، شکل
شمائل بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں، عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور
بعینہٖ متفاوت، حلیم، خلیق، کریم، مواضع، متشرع، شہر فہم،
سیکڑوں شعر یاد، نظم کی طرف توجہ نہیں نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے
ہیں۔ جلالانی طباطبانی کی طرز برتتے ہیں شگفتہ جبیں ایسے کہ اُن
کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی
تقریر سُن کر ایک نئی روح قالب میں آ جائے...

بعد اختتام محافل طالبِ رخصت ہوں گا۔ بعد حصول رخصت دلّی جاؤں گا۔
نواب کلب علی خاں کی جشنِ تاجپوشی میں غالب شریک تھے۔

غالب کے رامپوری لطائف:

غالب کے رامپور آنے کے چند روز بعد نواب کلب علی خاں لیفٹنٹ گورنر سے
ملنے کو بریلی جانے لگے تو روانگی کے وقت نواب صاحب نے غالب سے کہا:

"مرزا صاحب خدا کے سپرد۔"

مرزا نے کہا حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر مجھے اُلٹا خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

تفتہ کو لکھتے ہیں:

میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے۔ بھائی نواب مصطفےٰ خاں آکر ملے۔ وہ وارد دارالسرور رام پور ہوئے۔ اور میں جادہ نورد ستم آباد دہلی ہوں۔

غالب کو ملنے والی رامپوری امداد کی شکل یہ تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

ایک قرن ۱۲ برس سے فردوس مکان نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے اور سو روپیہ مہینہ ماہ بہ ماہ اور کبھی دو سو کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہے۔

مجروح کو رام پور سے رقم طراز ہیں:

قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے سو روپے مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا تو سو روپے بنام دعوت اور دیا۔

یعنی رام پور میں رہوں تو دو سو روپے پاؤں اور دلّی میں رہوں تو سو روپیہ۔ بھائی سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ وہ دوستانہ شاگردانہ دیتے ہیں۔ بہر حال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر یہ کمی کا شکوہ کیا۔ رقم کے ساتھ ساتھ تحفہ تحائف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مختلف تقریبوں پر انعام واکرام سے بھی نوازا گیا۔

کبھی کبھی غالب بھی نواب صاحب کو تحائف بھیجا کرتے تھے۔

غالب کو رام پور سے ملنے والا وظیفہ نہ تو دوستانہ تھا اور نہ ہی شاگردانہ، یہ کچھ سابقہ

سیاسی خدمات کا صلہ تھا، اور بخشش کا بہانہ تھا۔ استادی شاگردی کا سلسلہ تو ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء سے نواب یوسف علی خاں کی زندگی میں ہی چند سال کے بعد ختم ہو گیا جب کہ غالب دیگر شاگردوں کے کلام پر آخری لمحہ حیات تک اصلاح دیتے رہے۔

وہ تفتہ کو لکھتے ہیں:

> رئیس رام پور سو روپے مہینہ دیتے ہیں۔ سال گذشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم جو جو اس کا کام ہے اور میں اپنے کو حواس میں نہیں پاتا متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں جو کچھ مجھے سرکار سے ملتا ہے عوضی ''خدماتِ سابقہ'' میں شمار کیجیے تو میں سکہ بمہر سہی ورنہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ بہ شرطِ خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے اُن کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نومبر تک آتی ہے اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب از راہِ جواں مردی دیے جاتے ہیں۔

غالب کی تصنیفات رام پور کی وجہ سے محفوظ رہیں اور رام پور کی امداد سے شائع بھی ہوئیں وہ ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

> میرے پاس روپیہ کہاں جو ''قاطع برہان'' کو دوبارہ چھپواؤں۔ پہلے بھی نواب مغفور یوسف علی خاں نے دو سو روپے بھیج دیے تھے، تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپا تھا۔
>
> اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو روپیہ بھیجیں گے۔

اگر غدر کے بعد نواب مرزا کی دست گیری نہ کرتے تو جہاں اتنے اور خاندانوں کی بتاہی اور فاقہ کشی کی نوبت آئی وہاں مرزا کا بھی شاید یہی حال ہوتا اور اگر وہ غدر سے پہلے اپنا

اردو دیوان رام پور نہ بھیج دیتے تو ان کا اپنا مجموعہ نواب ضیاء الدین اور نواب حسین مرزا کے کتب خانوں کی تباہی کی وجہ سے تلف ہو گیا تھا اور جس طرح ذوقؔ آزاد اور نیر درخشاں کا بہت سا کلام اس ہنگامے میں جاتا رہا۔ دیوانِ غالب بھی اس آگ کی نذر ہو جاتا۔ ہنگامہ غدر میں مرزا کا وہی کلام بچا جو رامپور میں محفوظ تھا، باقی ضائع ہو گیا۔ چنانچہ اک خط میں لکھتے ہیں:

> بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب میرے سارے فارسی، نظم و نثر کے مسودات لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھر والوں پر جھاڑو پھر گئی، نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔

غدر سے پہلے مرزا صاحب نے اردو کلام کا ایک نسخہ رامپور بھیجا وہ سلامت رہا اور ان کی نقل سے ۱۸۶۱ء کو موجودہ دیوانِ غالب تیار ہوا۔

شیخ اکرام صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم کا دیوانِ غالب کا عطیہ ہے۔ اور اُس کے ایک معقول حصے میں غالب کے خط و خال اس طرح نمایاں ہیں کہ اگر اس حصے کو دیوان غالب کے ضمیمے کے طور پر شائع کر دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر مدثر عارف شان لکھتے ہیں:

> ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ نواب صاحب کی شاگردی دراصل غالب کو مالی امداد دینے کا بہانہ تھی کیوں کہ اول یہ کہ نواب صاحب کو شاعرانہ باتوں اور شاعرانہ طرز بیان سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا اور دوئم یہ کہ ان کا دربار خود مشاہیر روزگار محققین شعراء اور علماء سے بھرا ہوا تھا۔ جن میں سے کسی سے بھی یہ کام آسانی سے لیا جا سکتا تھا۔ شفقت و شریفانہ برتاؤ اور خیر سگالی کا یہ جذبہ نواب صاحب کی بے شمار فیاضیوں کی ایک

مثال ہے غالب پہلے سفر میں سید کے مراد آباد میں مہمان رہے۔
اور غالب نے جب رامپور سے دہلی کی طرف کوچ کیا تو راستے
میں سخت علیل ہو گئے اور رامپور کا آخری سفر مریض غالب کے
لیے زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔ مختلف امراض نے گھیر لیا۔ ہر
سال خود قطعہ تاریخ وفات کہنے لگے اور اپنی موت کی پیش گوئی
کرنے لگے۔ یہاں کہ ۱۵ رفروری ۱۸۶۹ء بہ مطابق ذیقعدہ
۱۲۸۵ھ پیر کے دن بہتر برس چار ماہ اس دنیا کی سیر کر کے
خاندان لوہارو کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے اور
آخری مراسم و قرض کی ادائیگی میں رامپور سے نواب کلب علی
خاں کی بھیجی ہوئی رقم کام آئی۔

جس طرح زندگی میں ان کی بہت سی خواہشیں پوری نہیں ہوئیں اسی طرح تجہیز و
تکفین بھی ان کے عقیدے کے خلاف ہوئی مزار پختہ بنایا گیا جس پر مرزا مجروح کا یہ قطعہ
تاریخ کندہ ہے۔

یا حیّ یا قیوم

رشک عرفی و فخر طالب مرد اسد اللہ خان غالب مرد
کل میں غم و اندوہ میں با خاطر محزوں
تھا تربتِ اُستاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا ''گنجِ معانی ہے تہہ خاک''

۱۲۸۵ھ

غالب کی طبّی بصیرت: اثاثۂ رامپور کے تناظر میں:

غالب کو عصری علوم و فنون پر غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ خاص طور پر وہ میڈیکل سائنس کے بہت بڑے جانکار معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے طبّی علوم و فنون کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ کچھ کتابوں پر غالب کے نشانات و مُہریں ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں کچھ طبّی کتابوں کے نام بھی تحریر کیے ہیں۔ غالب نے اپنے کچھ احباب کا کامیاب علاج بھی کیا جس میں ان کے دوست میرزا ابوالقاسم خاں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے غالب کو اپنی صحتیابی کے بعد منظوم سپاسنامہ پیش کیا اور اس میں انہیں بُوعلی سینا، افلاطُون و بُقراط کا ہم مرتبہ قرار دیا۔

غالب اپنے احباب کی بیماری کا حال سُن کر بے چین ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جب غالب کو داغ کے ذریعہ نواب کلب علی خاں صاحب کی علالت کا حال معلوم ہوتا تو غالب بے چین ہو گئے اور انہوں نے اس موقع پر نواب صاحب کو جو خط لکھا ہے وہ طبّی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں تشخیص بھی ہے، تجویز بھی، دوا و پرہیز بھی۔ طبّی اُصول سے غالب کا ایک ایک لفظ درست اور گنجینۂ معنی کا ایک طلسم ہے، خط ملاحظہ ہو:

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے، میں طبیب نہیں مگر تجربہ کار ہوں، ستر برس کا آدمی ہوں، ہوشیار ہوں
اور یہ کہا نہیں جاتا، حضرت پر بخار [illegible] ہرگز نہیں جاتا، خدا جانے اور طبیب کیا سمجھے ہیں
مرض کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ اشتراک معدہ و قلب مرض طاری ہوا تھا۔ آپ کو حفظ صحت کی رو سے
گاہ گاہ ناریل دریائی زہر مہرہ کا استعمال ضرور ہے اور معجون طلائی عنبری تقویت قلب میں
مجوزہ حکیم میر علی خاں مغفور ہے، ورق طلا عنبر اشہب عرق کیوڑہ قند کثرت اجزا اس کی ترکیب
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

غالب کے رامپور سے تعلقات کا سلسلہ نواب یوسف علی خاں ناظم سے شروع ہوا۔ نواب صاحب کو لکھے ہوئے غالب کے خطوط کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس میں طبّی خطوط بھی ہیں۔ نواب صاحب کو غالب کی طبّی بصیرت اور ادویہ شناسی کا علم تھا۔ انہوں نے اپنے ذاتی اور دواخانہ رام پور کے لئے دہلی سے ادویہ کی فراہمی کا ذمہ غالب کے سپرد کیا تھا۔ چنانچہ چوب چینی کی فراہمی کے سلسلے میں نواب صاحب نے غالب کو تحریر کیا۔ وہ خط غالب کو نہ پہنچ سکا۔ نواب صاحب نے رامپور سے ایک ہرکارہ غالب کے پاس روانہ کیا۔ غالب نے اُس کو چوب چینی فراہم کی۔ اس سلسلے میں غالب کا خط بیحد دلچسپ ہے۔

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے حضرت کی قدموں کی قسم چوب چینی کی ارسال کا حکم ڈاک سے میں نے نہیں پایا ۲۲ دسمبر کو ہرکارہ آیا نوازش نامہ شرف افزا لایا
دلی اب شہر نہیں چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر کے اُمرا نہ اطراف شہر کے رؤسا
بہر حال تین چار دکانوں ہر ایک جگہ سے منگوا کر رنگین و سنگین دولی گرہ یا کم گرہ
خود دیکھ کر پانچ سیر تحفہ چوب چینی ایک تھلیا میں رکھ کر آتش سے منہ بند کیا
پھر کپڑا سیتا اور رسی خوب مضبوط باندھ کر دو جگہ اپنی مُہر کی اور وہ تھلیا ہرکارہ کو سونپی
سو تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عزت و جاہ روز افزوں
روز دوشنبہ ۲۶ دسمبر ۱۸۶۶ء وقت صبح [illegible] سرکار

غالب چونکہ خود بھی بیمار رہا کرتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

”میں کچھ عرصے عوارضِ احتراقِ خون میں ایسا مُبتلا رہا ہوں

کہ جسم وجاں کی بھی خبر نہ رہی۔"

غالب اپنی خواہشات کے خلاف زندگی گزار رہے تھے۔ وہ ہمیشہ ذہنی کشمکش کا شکار رہے۔ اس سلسلے میں اُن کے خود بیانات بہت واضح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"عجب طرح سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میری حالت سراسر میرے خلاف طبیعت ہے۔ ایسی زندگی پر لاحول وَلا قُوَّۃَ اِلّا باللہ۔"

منشی ہرگوپال تفتہ نے مرزا غالب کی نبی بخش حقیر کی بیماری کا حال لکھا اور یہ بھی تحریر کیا کہ ماء الجبن سے بھی آرام نہیں ہوا۔ مرزا کا ذہن فوراً "طب محمد حسین خانی" کی طرف منتقل ہوا اور اس کے حوالہ سے یہ نسخہ لکھ بھیجا:

"ایک نسخہ "طب محمد حسین خانی" میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور بہت سودمند ہے مگر اثر اس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں اور اس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے۔ پھر اس باقی پانی کو چھان کر کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں اور جب باسی ہو جائے اس کو پئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں۔ کھایا کریں۔ پانی دن رات جب پیاس لگے یہی پئیں۔ نبرید کی حاجت پڑے اسی پانی میں پئیں۔ روز جوش کر وا کر چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا سلام کہہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا۔ آگے ان کو اختیار ہے۔"

نبی بخش نے لکھا کہ میں بدایوں کے ایک حکیم کی دوا کر رہا ہوں اس لیے ابھی آپ کی دوا شروع نہیں کر سکتا۔ اس پر مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"آپ غور تو کیجئے میں نے دوا نہیں بتلائی۔ ایک ترکیب پانی
کے مدبر کرنے کی عرض کی ہے۔ صاحبان امراض سوداویہ مزمنہ
کو اس پانی کا پینا نفع کرتا ہے۔ اور نفع اس کا برسوں میں ظاہر
ہوتا ہے اور اس پانی کے استعمال کے زمانہ میں دوا کی ممانعت
نہیں۔ جو دوا چاہئے کھایئے اور جو غذا چاہئے تناول فرمایئے۔
صرف یہ پانی کب دوا ہوسکتا ہے۔ آپ شوق سے اس پانی کو
شروع کیجئے اور دوا طبیب کی بدستور کئے جایئے اور غذا موافق
طبیب کے کھائے جایئے۔ پانی جب پیجئے تب یہی پانی پیجئے۔
جہاں جایئے آدمی کو حکم کیجئے کہ ایک صراحی اس پانی کے ساتھ
لے لیوے اور یہ بھی آپ کے خیال میں رہے کہ اگر ناگاہ کوئی
ضرورت لاحق ہو اور یہ پانی موجود نہ ہو اور آپ اور پانی بحسب
ضرورت پی لیویں تو بھی محل اندیشہ نہیں ہے۔"

غالب اور پاکھل:

مشرقی ادب میں پاگڑھ و گولڑہ کو افسانوی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کا مشہور نباتاتی شعر ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جس طرح ایک لمبے عرصے کے بعد انسانوں میں غیر معمولی خصوصیات کے حامل انسان پیدا ہو جاتے ہیں۔ پتھروں میں عام ہیروں و جواہرات کے ساتھ کوہِ نور وغیرہ دریافت ہوتے ہیں، یہ عمل اشجار میں بھی جاری ہے جس کی نشاندہی بہت واضح طور پر غالب نے کی ہے۔ مشہور ہے کہ شاہجہاں نے جب لال قلعہ کی تعمیر کی تو وہاں ایک ایسا درخت تھا، تھا تو وہ پاکھڑ

کی جنس۔ جس میں عام طور پر چنے کے حجم کے برابر پھل آتے ہیں لیکن اس درخت میں آڑو وسیب کے برابر پھل لگا کرتے تھے۔ بقول غالب ان کے علم میں یہ کمیاب درخت تھا اور حیات بخش باغ میں اِس کا ایک درخت تھا۔ جس کی سخت حفاظت کی جاتی تھی۔ ۱۲/دسمبر ۱۸۴۵ء کے بہارشاہ ظفر کے روزنامچہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس درخت میں صرف سو پھل آئے جس میں سے پچاس دانے میرزا شاہ رُخ کو دے دیے گئے اور پچاس دانے شاہی دواخانے میں مربّے واچار کے لیے حکیم احسن اللہ خاں کے سپرد کردیے گئے۔ اس درخت کا پھل امراضِ جگر میں غیر معمولی فائدہ مند کہا جاتا تھا۔ غالب کے واسطے سے اِس پیڑ کی کمیابی اور پھل کی افادیت کا علم نواب کلب علی خاں صاحب کو ہوا۔ نواب صاحب نے خدا معلوم کس طرح سے اس پیڑ کو حاصل کیا۔ جس کو اہلِ دہلی پاکھل کہتے تھے اور اہل رامپور ''پاکھٹ'' کہتے ہیں۔ یہ پیڑ بحمد للہ نواب کلب علی خاں کے وقت سے آج تک نواب صاحب کے لگائے ہوئے ''باغِ بےنظیر'' میں موجود ہے۔ اس درخت کے بارے میں لکھا تو پاکھڑ کے ذیل میں نجم الغنی خاں وغیرہ ؒ نے بھی ہے لیکن اس سلسلے میں غالب کے برابر معلومات وتجربات کسی اور کے معلوم نہیں ہوتے۔

نجم الغنی خاں پاکھل کے بارے میں لکھتے ہیں:

> حکیم شریف خان کی تالیف شریفی اور حکیم غلام امام کی معالجات النوی معروف بمفردات امامی وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک قسم ایسی بھی ہے۔ جس کا پھل ابتداے پیدائش کے زمانے میں آڑو کے برابر ہوتا ہے اور پک کر زرد اور سیب ولائتی کے برابر ہو جاتا ہے۔ یہ قسم بہت کمیاب ہے اس کا ایک دخت دہلی کے قلعہ بادشاہی میں اب تک بتاتے ہیں۔ اس قلعہ کے بننے سے قبل درخت موجود تھا۔ سلاطین ہند اُس کو نادرات سے جان

کر بہت محافظت کرتے تھے بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اُس کی
جڑ میں دودھ ڈلوایا کرتے تھے اور اس کے پھلوں سے مربا تیار
کراتے تھے جو ورم طحال کے مریض کو فائدہ دیتا تھا یہ قسم پاکل
کے نام سے معروف ہے۔

حسن احمد نظامی

غالب کے رامپوری معاصرین

مرزا غالب کے دربار رام پور سے روابط کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان کے بعض شاگردوں کا ذکر بھی مفصلاً یا مجملاً مختلف مؤلفین نے کیا ہے۔ غالب دو مرتبہ رام پور آئے اور دونوں مرتبہ چند ماہ یہاں قیام پذیر رہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے یہاں دورانِ قیام رام پور کے ہم عصر شعرا اور دیگر اہل کمال سے روابط رہے ہوں گے۔ جن میں سے بعض ان سے ان کے مراسم رام پور میں ۱۸۶۰ء میں پہلی مرتبہ آمد سے قبل بھی رہے تھے اور دوسری بار ۱۸۶۵ء میں یہاں کا قیام ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ مراسم یقیناً قائم رہے ہوں گے۔ وہ اپنے ایک خط میں سرزمین رام پور کو رشکِ شیراز و اصفہان قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"...... یہاں کا ارمغان اہل شہر کی کشش سیرت و صورت اور روش خلوص و مروت ہے یا نواب عالی جناب مطلع الالقاب کا

دیدارِ پرانوار اور گل افشانی گفتار ہے۔ شہر کا حال یہ ہے کہ ذوق
شعر گوئی و شعر فہمی کا جو پایہ میں نے یہاں پایا جمیع اہل ہند کو بھی
میسر نہ آیا۔ رام پور کہاں ہے اس باب میں روکش شیراز و
اصفہان ہے۔ ہر شخص شعر کا فریفتہ، شعر ہر شخص پر فریفتہ''

سرزمین رام پور اس وقت اہل کمال کا مجمع تھی۔ ظاہر ہے کہ دوران قیام وہ مختلف لوگوں سے ملتے رہے ہوں گے۔ لیکن اب ایسا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے کہ وہ کن کن لوگوں سے ملے تھے؟ اور ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ تاہم از روئے انصاف صرف انہیں لوگوں کو ان کے معاصرین میں شمار نہیں کرنا چاہئے جن کو اعلانیہ طور پر ان سے نسبت شاگردی حاصل تھی بلکہ ان لوگوں کو بھی معاصرین کے زمرے میں شامل کرنا چاہئے جن کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ غالب کے شاگرد نہیں ہیں لیکن یہ قرین قیاس ہے کہ ان لوگوں کا کچھ اثر غالب کے مزاج شعری پر پڑا ہو اور ان لوگوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ غالب کا کچھ نہ کچھ اثر قبول کیا ہو۔

غالب کے رام پوری معاصرین متعین کرنے میں ایک زبردست دشواری یہ ہے کہ تذکروں اور رام پور سے متعلق لکھی گئی کتابوں میں ان میں سے بیشتر کی تاریخ یا سنہ ولادت اور سنہ وفات اور تاریخ وفات بھی دستیاب نہیں ہے اور نہ ہی ان لوگوں کی شاعری کے ارتقائی منازل کی کوئی باقاعدہ نشان دہی کی گئی ہے لیکن چونکہ غالب کے سرزمین رام پور سے روابط نواب یوسف علی خاں ناظم کے قیام دہلی سے شروع ہو کر نواب کلب علی خاں کے عہد تک رہے ہیں اس لئے تقریباً ۱۸۲۰ء سے ۱۸۷۰ء تک یعنی پچاس سال کے عرصے میں جو شعرا رام پور میں موجود تھے خواہ وہ بہ اعتبار عمر غالب سے بڑے ہوں، ہم عمر ہوں یا خورد لیکن ان کو ان کے معاصرین میں شمار کرنا بے جا نہ ہوگا۔

راقم الحروف نے غالب کے رامپوری معاصرین کو دو زمروں میں رکھا ہے۔

زمرۂ اول میں ان معاصرین کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کو مختلف اہل نظر نے غالب کا شاگرد تسلیم کیا ہے۔

زمرۂ دوم میں وہ شعرا شامل کیے گئے ہیں جو گمان غالب ہے کہ یہ لوگ غالب کی رام پور تشریف آوری کے دونوں موقعوں پر موجود تھے۔ بہر حال عمومی طور پر ان میں وہ شعرا شامل ہیں جن کی ۱۸۲۰ء سے ۱۸۷۰ء تک کچھ نہ کچھ پہچان بن چکی تھی۔

دونوں زمروں کے شعرا کو تخلص کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس ترتیب میں حروف تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

زُمرۂ اوّل۔ تلامذۂ غالب

(۱) احسن، حکیم مظہر احسن خاں:

حکیم مجتبیٰ خاں کے بیٹے تھے امیر مینائی نے اپنے تذکرے کی تالیف کے وقت (۱۸۷۳ء) میں ان کی عمر ۲۶ سال بتائی ہے جس کی رو سے ۱۸۴۷ء سن ولادت قرار پاتا ہے جب کہ "تذکرۂ کاملانِ رام پور" کی رو سے سنہ ولادت ۱۸۴۴ء قرار پاتا ہے بہر حال ان کا شمار غالب کے تلامذہ میں ہوتا ہے چونکہ انہوں نے رائج الوقت علوم کی تحصیل تو مقامی علما سے کی لیکن شاعری میں پہلے غالب کے شاگرد ہوئے اور ان کی وفات کے بعد اسیر لکھنوی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔

ایک دیوان فارسی اور ایک اردو دیوان ترتیب دیا تھا لیکن کہیں دستیاب نہیں۔ مالک رام نے ان کے چند اشعار دیئے ہیں اور اسی طرح دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی۔

انہوں نے "عروض سیفی" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور آخر عمر میں پیلی بھیت میں رہنے لگے تھے وہاں کچھ عرصے تک ایک ہفتہ وار اخبار "خورشید آفاق" کے نام سے نکالا۔ پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے لیکن تجارت بھی کرتے تھے۔ پیلی بھیت میں ان کے متعدد شاگرد ہوئے۔ ۱۸۹۱ء میں وہیں پر انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

پیش نگاہ چہرۂ پر نور یار ہے
موسیٰ ہیں ہم یہ جلوۂ پرودگار ہے

--

بات کرنے میں تو شرماتے ہو تم
ظلم کرنے میں نہیں آتا لحاظ

--

نا مہربانیوں پہ تو مرتا ہے اک جہاں
کہیے کہ کیا غضب ہوا گر مہرباں ہوں آپ

اخگر، حکیم فتح یاب علی خاں:

ان کے والد جو مظفر حسین خاں کے نام سے مشہور ہوئے گرم تخلص کرتے تھے جن کے دو ضخیم دیوان موجود ہیں اور جن کا اصل نام ظفر یاب خاں تھا انہیں کے بیٹے اخگر ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے اور چونکہ ان کے والد بیشتر نواب محمد سعید خاں کے بھائی عبداللہ خاں بہادر کی رفاقت میں دہلی، میرٹھ اور دوسرے شہروں میں رہے لہٰذا ان کی ابتدائی تعلیم ہندوستان کے مشہور لوگوں کی نگرانی میں ہوئی۔

اخگر کے بیٹے ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور اپنے دادا گرمؔ اور والد اخگر کی مناسبت سے شعلہ تخلص کرتے تھے پھر اسے بدل کر فدا تخلص کر لیا تھا انہیں فدا نے بنکم چندر چٹرجی کے مشہور ناول ''وشاورکھا'' کا اردو ترجمہ ''بس کا روکھ'' کے نام سے کیا جو شائع ہو چکا ہے۔

مالک رام صاحب کے بیان کے مطابق فتحیاب علی خاں اخگر کا انتقال ہگلی میں ۱۹۱۵ء میں ہوا۔ اخگر کی ایک بیاض رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے اور دو نثری

داستانیں ''داستان علم شاہ'' اور ''داستان فرخ شاہ سوار'' بھی مذکورہ لائبریری کے ذخیرۂ قلمی میں محفوظ ہیں۔ امیر مینائی نے لکھا ہے کہ وہ مرزا اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ دہلوی کے شاگردی سے مورد افتخار ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عمر گو صحبت انساں ہی میں گذری اپنی
پر تماشا ہے کہ دیکھا نہیں انساں کوئی

--

سیاہی دونوں میں ٹھہری موافقت کے سبب
ہمارے بخت کی دمساز ہے ہماری رات

--

قابو نہ تھا جو دل پہ تو اخگر بتایئے
جانا ہی اس کے پاس تمہیں کیا ضرور تھا

بیتاب، صاحبزادہ عباس علی خاں:

یہ نواب غلام محمد خاں کے پوتے، صاحبزادہ عبدالعلی خاں کے بیٹے اور صاحبزادہ عنایت علی خاں عنایت کے بڑے بھائی تھے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم آپ کے چچازاد بھائی اور بہنوئی تھے۔ جب ان کے چچا نواب محمد سعید خاں مسند نشین ریاست رام پور ہوئے تو یہ بھی اہل خاندان کے ساتھ رام پور آ گئے دوران قیام دہلی میر مومن خاں مومن کے شاگرد ہوئے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ''تذکرہ گلشنِ بے خار'' میں لکھتے ہیں کہ:

''خانِ والاشان، مومن خان کے شاگردوں میں سے ہیں'' (ص ۱۳۷)

انہوں نے اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مومن کی شاگردی اختیار کی تھی لیکن مومن خان کے انتقال کے بعد یہ غالب کے تلامذہ میں شامل ہو گئے شبیر علی خاں شکیب کے بیان کے

مطابق۔ غالب ۱۸۶۵ء میں دوبار رام پور آئے تو یہ ان کے اعلانیہ شاگرد بنے۔ ان کا قلمی دیوان رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ جس پر غالب کی اصلاحات بھی مندرج ہیں۔ امیر مینائی اور دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی بیتابؔ کے کلام کی مختلف انداز میں تعریف کی ہے ان کا دیوان ''گلدستہ باغ جناں'' کے نام سے رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے جس میں غزلیات کے علاوہ مثنوی، واسوخت اور قطعات تہنیت بھی شامل ہیں۔ انہوں نے تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں ۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔

غالب کے دیگر تلامذہ کی طرح ان کے کلام پر بھی غالب کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا ہے ویسے بھی وہ غالب کے آخر میں شاگرد ہوئے جب وہ مسلسل علیل رہنے لگے تھے۔ بیتابؔ کا نمونہ کلام یہ ہے:

خیر گذری کہ ذرا چونک کے پھر لگ گئی آنکھ
رہ گیا یوں ہی سا کچھ حشر کا غوغا ہو کر

معمول ہے خدا کی عنایت سے میکدہ
ساقی اگر نہیں تو نہ ہو مئے سے کام ہے

بیتابؔ پی، خدا نے تجھے بھی دیئے ہیں ہاتھ
یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ یہ جام ہے

سروشؔ، صاحبزادہ عبدالوہاب خاں:

یہ بھی نواب غلام محمد خاں کے پوتے اور صاحبزادے عبدالرحمٰن خاں کے فرزند تھے ان کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور سنہ وفات بھی معلوم نہیں۔ تذکرہ ''انتخاب یادگار'' مؤلفہ امیر مینائی کی ترتیب کے وقت یعنی ۱۲۹۰ھ میں سروش موجود تھے۔ انہوں نے بھی

مومن کی شاگردی اختیار کی تھی لیکن بعد میں غالب کو اپنا کلام دکھانے لگے تھے مالک رام صاحب نے ان کا سنہ ولادت ۱۲۴۸ھ تحریر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ غالب کی وفات کے بعد خوش بخت خاں خورشید سے بھی مشورہ سخن کرتے تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

سچ تو یہ ہے لاکھ سر مارا کرو ماتھا گھسو
کچھ کرو لکھا نہیں مٹتا کبھی تقدیر کا

قتل عالم کو کیا ایک نظر میں تو نے
کوئی باقی ہے ستم گار کہ پرساں ہوگا

شوخ، نادر شاہ خاں:

ان کے والد محمد ضامن خاں رام پور کے پٹھان تھے لیکن شوخ دلی میں پیدا ہوئے۔

۱۸۶۰ء میں جب مرزا غالب نواب محمد یوسف خاں بہادر کی دعوت پر رام پور تشریف لائے تو شوخ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح کی درخواست کی لیکن مرزا نے یہ کہہ کر کہ چونکہ وہ دربار رام پور کے وظیفہ خوار ہیں اس لیے رام پور میں والی رام پوری کی اجازت کے بغیر کسی کو شاگردی میں لینا مناسب نہیں سمجھتے۔ اصلاح دینا منظور نہیں کیا لیکن بعد میں چند غزلوں کی اصلاح کی۔ شوخ دہلی میں بھی وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے لیکن دس پانچ، غزلوں پر ہی اصلاح کر پائے۔

شوخ شروع سے سررشتۂ دار بندوبسن کی حیثیت سے دہرہ دون میں ملازم رہے بعد کو وسط عمر میں طلب معاش کے لیے بنارس چلے گئے وہاں کلکٹری کے دفتر میں پہلے نائب ناظر اور بعد کو پیشکار مقرر ہو گئے۔ وہاں مرزا قادر بخش صابر سے (جو اُن دنوں بنارس میں مقیم تھے) مشورہ کرنے لگے۔ اس کے بعد کلکتہ میں کچھ تجارت کا سلسلہ شروع کیا۔ وہیں

مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات ہوئی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں وفات پائی۔ شوخ کبھی کبھی شوخ تخلص بھی کرتے تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

بنا کروں کوئی میخانہ جی میں ہے شوخی
کہ بعد مرگ زمانہ میں یادگار رہے

حضرتِ شوخ ہوئے ہجر میں مرنے کے قریب
نوجوانوں کو یہ آزار برا ہوتا ہے

بخت مراد مثل زلیخاں جواں ہوا
پیری میں دل بکا کسی یوسف بقا کے ہاتھ

شوخ کا تذکرہ ''تلامذۂ غالب'' میں مالک رام صاحب نے کہا ہے انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ''نقش آزاد'' سے روشنی حاصل کی ہے جس میں نادرشاہ خاں شوخی کے غالب سے والہانہ محبت اور شاگردی استادی سے متعلق متعدد واقعات قلمبند کیے ہیں۔

لالہ سری رام کے تذکرے ''خمخانہ جاوید'' میں بھی ان کا تذکرہ ملتا ہے۔

شہاب، شہاب الدین خاں:

شہاب الدین شہاب رام پوری حکیم نصرالدین خاں کے صاجزادے تھے ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے ریاست کی فوج میں ایک پلاٹون کے حولدار تھے فن طب میں کچھ شدھ بدھ رکھتے تھے ان کا تذکرہ، تذکرۂ ''یادگار ضیغم'' اور ''انتخاب یادگار'' میں نہایت مختصر طور پر مندرج ہوا ہے۔

مالک رام نے انہیں غالب کے تلامذہ میں شمار کیا ہے ان کے صرف دو ہی شعر

فی الحال دستیاب ہیں ملاحظہ ہوں:

تو بھول گیا مجھے اے سرو گل انداز
ایک دم میں تیری یاد سے غافل نہیں ہوتا

فتنہ دہر ہو بیٹھے ہی رہو
گر اٹھو گے تو قیامت ہوگی

شہیرؔ، حافظ محمد خاں:

حافظ غلام حسین خاں رام پوری کے پوتے اور مولوی غلام محمد خاں کے صاحبزادے تھے ۱۲۶۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی ''نور چشم راحت جان'' ان کی تاریخ ولادت ہے۔

شہیرؔ اپنے والد کی انگریز سرکار کی ملازمت کی وجہ سے مختلف مقامات پر اقامت گزیں رہے ان کے والد پنشن لینے کے بعد چھنڈوارا میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں انہوں نے جائیداد بھی خرید لی تھی۔

شہیرؔ کو شعر گوئی کا بچپن ہی سے شوق تھا غالب جیسا استاد میسر آ گیا تو یہ شعر و شاعری کے رموز سے خوب واقف ہو گئے۔ غالب کی وفات کے بعد یہ نواب بھوپال کے یہاں ان کے دو بیٹوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ یہ نور الحسن خاں کریمؔ کے استاد بھی مقرر ہوئے۔ وہ نغمہ و نثر فارسی میں غالب کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے تھے جب خواب شاہجہاں بیگم (والیہ بھوپال) کو تاج ہند کا تمغہ ملا اور انہوں نے قصیدہ لکھا تو ممدوحہ کی جانب سے انہیں ''افتخار الشعرا'' کا خطاب ملا۔

ان کی زیادہ تر توجہ فارسی شاعری پر مبذول رہی لیکن اردو میں بھی برابر مشق سخن کرتے رہے۔

نواب نورالحسن خاں کریم کے تذکرہ شعرا بعنوان ''تذکرہ طور کریم'' کے تعلق سے مالک رام ''تلامذۂ غالب'' میں صفحہ ۳۲۵ پر قم طراز ہیں کہ:

محمد عباس شروانی رفعت (شاگرد غالب) اپنی بیاض میں لکھتے ہیں یہ تذکرہ دراصل محمد خاں شہید کا لکھا ہوا ہے'' (واللہ اعلم)

ان کا انتقال ۱۹۰۱ء میں بھوپال میں ہوا اور وہیں مدفون ہیں چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

پوچھو نہ اہل عشق کو کیا ہیں کہاں کے ہیں
اچھے ہیں، جس طرح کے ہیں، جو ہیں، جہاں کے ہیں

میں نام دار ہجر، عدو کام گار وصل
وہ کام کر گیا ہے، تو میں نام کر گیا

کوئی ہو ان کی وحشت دل کا علاج ہو
اک ہم اگر نہ سہی، غیر ہی سہی

فدا، صاحبزادہ فدا علی خاں:

یہ نواب یوسف علی خاں ناظم کے بھتیجے تھے کیونکہ ان کے والد نواب محمد کاظم علی خاں بہادر، نواب محمد سعید خاں کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ فدا کے والد بھی شعر گوئی سے شوق رکھتے تھے اور سروری تخلص کرتے تھے یہ بھی اپنے دوسرے اہل خاندان کے ساتھ ۱۸۴۰ء میں نواب محمد سعید خاں کی تاج پوشی کے بعد رام پور آئے۔ ابتدأ نواب مرزا علی خاں داغ دہلوی سے اصلاح لیتے تھے لیکن بعد میں فدا غالب سے بھی فیضیاب ہوئے ''تلامذۂ غالب'' میں ''انتخاب یادگار'' کے حوالے سے تین شعر دیئے گئے ہیں۔ ایک شعر غزل کا ہے۔

یاد آتی ہے جب کاوشِ مژگاں مرے دل

دیتا ہے تسلی تیر پیکاں مرے دل کو

اس کے علاوہ دو شعر قصیدے کے ہیں جو کہ انہوں نے نواب کلب علی خاں کی مدح میں کہا تھا۔

تازگی ہے یہ ہوا میں کہ برنگ مقبول

سبز ہو جائے جو گلشن میں گرے دانہ بیل

شرف افزائے جہاں، صاحب تخت و اکلیل

حکم کی جس کے فلک کو بھی ہے واجب تعمیل

محشر و خانم جان، مرزا عبداللہ خاں:

مرزا عبداللہ خاں رام پور ثم دہلوی کا ذکر بعض تذکروں میں ملتا ہے لیکن زیادہ تر میں نہیں۔ البتہ ''تلامذۂ غالب'' میں مالک رام نے نہ معلوم کس لحاظ سے غالب کے شاگردوں میں ان کا ذکر کیا ہے غالباً کلکتہ میں عبدالغفور نساخ کے توسط سے غالب سے ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ یہ دراصل ریختی کے شاعر تھے اور خانم جان تخلص کرتے تھے لیکن محشر تخلص کے ساتھ صاف و سادہ کلام بھی کہہ لیتے تھے۔ بقول مالک رام:

''فقیر منش اور دریا دل آدمی تھے جو آتا تھا لٹا دیتے تھے''

ان کے دو شعر قابل توجہ ہیں:

ہجر میں تسکین دیتا میں کہ سر کو پیٹتا

ایک دل پر ہاتھ تھا میرا، جگر پر دوسرا

کہیں تم چوچلے میں بھید کچھ ان سے نہ کہہ دینا

مری اجھی بوا یہ مردوے مطلب کے ہوتے ہیں

مغلوؔب، سید افتخار الدین:

یہ سید کفایت اللہ کے بیٹے تھے۔ ''انتخاب یادگار'' میں ان کے بارے میں صرف یہ لکھا ہے کہ عین جوانی کے عالم میں صرف ۲۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

مغلوؔب مرزا غالب کے علاوہ میر احمد علی رسؔا سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ بطور نمونہ چند شعر ملاحظہ ہوں:

کون سے ناز کا مغلوؔب ہے بسمل، قاتل
جس کی ہچکی میں بھی آواز ہے قاتل، قاتل

تم اگر ایک ہو صورت میں تو وہ الفت میں
تم جو یکتا ہو تو مغلوب بھی لاثانی ہے

کس کے عارض کا تصور دلِ ناداں ہے تجھے
آئینہ کس نے دکھایا ہے کہ حیرانی ہے

نادؔم، فخر الدین:

ان کا تذکرہ ''تلامذہ غالب'' میں مالک رام نے کیا ہے ان کے بارے میں کسی اور کتاب میں کوئی ذکر نہیں ہے البتہ ''اخبار الصنادید'' جلد دوم مؤلفہ نجم الغنی خاں کے مطابق نواب حامد علی خاں نے جب رام پور کے قلعے کی تعمیر کرائی تو انہوں نے اردو میں ایک قطعۂ تاریخ کہا تھا جو درج ذیل ہے:

قلعہ جو بنایا ہے سرکار نے
کہ ہر وقت جس میں برستا ہے نور

لکھی اس کی تاریخ ناد‌م نے یوں
بنا خوب (جب) قلعۂ رام پور
۱۳۳۰ھ

ناظم، نواب یوسف علی خاں:

نواب یوسف علی خاں ناظم نواب محمد سعید خاں کے بیٹے تھے۔ ۵ر مارچ ۱۸۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۸۴۰ء تک ان کا قیام دہلی میں رہا۔ وہاں پر علما و فضلا سے تحصیل علم کی ان کے والد نواب محمد سعید خاں بھی ۱۸۴۰ء میں رام پور آنے سے قبل بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے جب سنہ مذکور میں انہیں رام پور کا نواب تسلیم کر لیا گیا تو نواب یوسف علی خاں ناظم بھی بحیثیت ولی عہد رام پور آ گئے۔ شاعری میں انہوں نے حکیم مومن خاں مومن کو اپنا استاد بنایا تھا۔ ابتدا میں یوسف تخلص کرتے تھے۔ بعد میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے اور غالب کے مشورے سے ناظم تخلص اختیار کیا۔ ناظم نے غالب کے طرز شاعری کو اپنانے کی کافی کوشش کی تھی۔ غالب کے بعد ان کو لکھنوی طرز شاعری نے بھی کافی متاثر کیا اور وہ اسیر لکھنوی کو اپنا کلام دکھانے لگے تھے۔ نواب موصوف کے کئی بھائی اور دوسرے اعزاء بھی دوران قیام دہلی مومن سے استفادہ کرتے رہے اور ان میں بعض غالب سے بھی وابستہ ہوئے اور جب نواب یوسف علی جاں بحیثیت ولی عہد رام پور آ گئے تو انہوں نے یکے بعد دیگرے ان سب کو بھی رام پور طلب کر لیا۔ ان سبھی کا ذکر راقم الحروف نے مناسب مقام پر کیا ہے۔

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں ناظم اپنے والد کی وفات کے بعد فرمانروائے ریاست ہوئے۔ ۱۸۵۷ء میں ہنگامۂ غدر میں انہوں نے اس طرح سے رول ادا کیا کہ انگریز فتح یاب ہو جائیں تو ان کی ریاست محفوظ رہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انگریزوں سے فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ کا لقب حاصل ہوا۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں سرزمین رام پور دہلی اور لکھنؤ کے اہل کمال کا مجمع بن گئی تھی۔ انہوں نے شعرا اور اہالیان ادب کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ ناظم کا ایک دیوان جس پر غالب کی اصلاحات موجود ہیں رضا لائبریری کے مخطوطات میں موجود ہے (شمارہ نمبر ۱۰۰۱)

نواب موصوف کی وفات کے بعد ان کا کلیات شائع ہوا جس میں غزلیات کے علاوہ دیگر اصناف سخن بھی موجود ہیں۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کی والدہ فتح النساء بیگم تھیں جو جناب عالیہ کے لقب سے مشہور تھیں ان کا مقبرہ، مقبرہ جناب عالیہ اب ایک محلّہ کے بطور مشہور ہے۔ یہ نواب فیض اللہ خاں بہادر کی ایک سوتیلی بہن نیاز بیگم بادشاہ محمد خاں کے عقد نکاح میں تھیں ان کے صاحبزادے محمد نور خاں کی بیٹی فتح النساء بیگم (حیات عالیہ) تھیں ناظم کی والدہ کی وفات ۱۸۵۹ء میں ہوئی۔ غالب نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

جناب عالیہ از بخشش حق
بہ فردوس بریں چو کرد آرام

سخن پرداز غالبؔ سال رحلت
خلود خلد گفت از روئے الہام

۱۲۷۵ھ

ناظم زمانہ طالب علمی میں دلی میں آئے، مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے عربی اور دیگر علوم عقلیہ بھی پڑھتے تھے اور فارسی کی تحصیل مالک رام صاحب کے بقول غالب سے کی لیکن بعد میں خلیفہ غیاث الدین رام پوری صاحب ''غیاث اللغات'' سے بھی پڑھی۔

یہ بات تو طے ہے کہ غالب سے ناظم نے اصلاح لی اور بعد میں اسیرؔ اور امیرؔ کو

بھی اپنا کلام دکھایا لیکن ان کے مومن کا شاگرد ہونے کے سلسلے میں کافی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں قلم اٹھانے والے حضرات نے اپنے اپنے دلائل اور براہین کے ذریعے مثبت و منفی پہلو پیش کیے ہیں تاہم اس سلسلے میں کوئی بات بھی قول فیصل نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ محققین حضرات اس سلسلے میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر عمیق مطالعہ کریں اور حقائق کی تلاش و جستجو اور ایسے مدلل امور کی تلاش کریں جو حقائق کے قریب سے قریب تر ہوں۔

کچھ اہل علم حضرات نے ناظم کے ایک پختہ فنکار اور کہنہ مشق شاعر ہونے میں شک کا اظہار کیا ہے جن میں مولوی عبدالحق، ہاشمی فرید آبادی اور شیخ محمد اکرام وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ناظم کے شاعر نہ ہونے کی بات محض قیاس پر مبنی ہے اس سلسلے میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ کوئی بھی مبتدی صرف چار برس کی قلیل مدت میں مکمل دیوان تیار نہیں کر سکتا جبکہ ناظم نے صرف چار سال کی مختصر مدت میں اپنا مکمل دیوان تیار کر لیا جس میں ایک ماہر فن شاعر کے کلام کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس بات کو بنیاد بنا کر یہ قیاس کر لیا گیا کہ ناظم کا کلیات ان کا نتیجۂ فکر نہ ہو کر ان کے استاد مرزا غالب کی فکر کا ثمرہ ہے راقم السطور کے خیال میں یہ صرف ایک مفروضہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ رام پور رضا لائبریری میں غالب کا اصلاح کردہ کلیاتِ ناظم کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔

ناظم کی شعر گوئی پر شک کرنے والے حضرات اس سلسلے میں یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ ناظم اور غالب نے مل کر ارادتاً ایسا کلیات ترتیب دے لیا ہوگا جس میں غالب کی اصلاح ظاہر ہوتا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کو ناظم کی شعر گوئی میں کوئی تردد نہ ہو لیکن اس دلیل کو بھی حرف آخر ماننے کی کوئی خاص وجہ نہیں کیونکہ صرف ناظم ہی کیا ہر ایسے شاعر کے بارے میں یہ بات اٹھائی جا سکتی ہے جس کا اصلاح شدہ کلام موجود ہو۔ اب رہا سوال یہ کہ

ناظم کے کلام پر غالب کا بہت زیادہ رنگ چڑھا ہوا ہے تو یہ بھی کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے کیونکہ شاگرد کے کلام میں استاد کا عکس دکھائی دینا ایک فطری امر ہے اور ویسے بھی اساتذہ کے کلام میں اکثر ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں دیگر شعرا کا رنگ و آہنگ صاف جھلکتا ہے۔

بہرکیف ضرورت اس بات کی ہے کہ اہل علم حضرات ازسرنو اس سلسلے میں تلاش و جستجو کریں اور ٹھوس حقائق کو منظر عام پر لائیں فی الوقت جب ہمارے سامنے ناظم کا کلام موجود ہے تو پھر ان کو شاعر تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مضمون آفرینی، معاملہ بندی، فراق و وصال کے مضامین، رقیب روسیاہ کا بیان، نامہ بر سے تعلق، واعظ پر لعن وطعن، لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی حکایات جیسے روایتی پہلو ہی ناظم کے کلام کا خاصہ ہیں۔ علاوہ ازیں بات میں بات پیدا کرنا زبان اور بیان کے ذریعے لطافت پیدا کرنا بھی ناظم کی خوبی ہے۔ ذیل میں ان کے کچھ اشعار بطور نمونہ سپرد قرطاس کیے جا رہے ہیں۔ ان اشعار سے ان کے فن اور کلام کی خصوصیات کا اندازہ ہو جائے گا۔

میں بھی ہوں حضرت ناصح دانا
کچھ سمجھ کر مجھے سمجھایئے گا

کر کے خوں ایک کا جا بیٹھے ہیں گھر میں اور پھر
پوچھتے ہیں کہ میرے در پہ ہے غوغا کیسا!

سامنے سے ترے آئینہ اٹھا لوں کہ مجھے
تیرے ناوک سے ہے منظور بچانا تیرا

شہر کے لڑکوں کی بر آئی مراد
بند سے دیوانہ رہا ہوگیا

چلے ہو دشت کو ناظم اگر ملے مجنوں
ذرا ہماری طرف سے بھی پیار کرلینا

آنکھیں کھلی ہیں گیسوئے پیچاں کی یاد میں
دیکھو چراغ جلتے ہیں کالوں کے سامنے

باتوں میں کوئی کام نکلتا ہے ہمنشیں
تھا نامہ بر کو خوبیٔ تقدیر پر گھمنڈ

آستیں بھی نچوڑ ڈالیں گے
اشک کے پونچھنے سے فرصت ہو

واں شہادت کی خوشی کیا ہو جہاں ہو یہ غم
کہ میرے قتل سے دلدار پشیمان ہوگا

اے نواسنج اناالحق ترا دعویٰ حق ہے
نیک دستور نہیں قطرے کو دریا کہنا

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں کیا بتلاؤں
میں نے میخانے سے کس کس کو نکلتے دیکھا

زمرۂ دوم:

احمد، خلیفہ شیخ احمد علیؒ:

خلیفہ شیخ احمد صاب کے والد گرامی کا نام شیخ نادر علی تھا آپ ۱۲۱۹ھ بمطابق ۱۸۰۵ء میں متولد ہوئے۔ فارسی کی کتابیں مولوی غیر شاہ خاں عنبر و آشفتہ اور کبیر خاں تسلیم سے پڑھیں۔ عربی و دینی علوم وفنون شہر کے دوسرے علما سے حاصل کیے۔ ادبیات فارسی سے آپ کو غیر معمولی شغف تھا۔ رام پور کے بیشتر فارسی ادب کے اساتذہ اور علما کا سلسلہ آپ کی ذات تک پہونچتا ہے۔ نواب کلب علی خاں اور نواب حامد علی خاں کی استادی کا شرف بھی حاصل تھا آپ نے تقریباً ۹۰ سال کی عمر پائی اور بنگلہ آزاد حال میں واقع اپنے مکان میں انتقال کیا۔ ان کا مزار اور خانقاہ احمدیہ آج بھی مرجع عوام وخواص ہے۔

خلیفہ احمد علی صاحب کی ملاقات مرزا غالب سے ہوئی اور عرفی کے بعض اشعار پر دونوں کے مابین کچھ بحث ومباحثہ بھی ہوا۔ شیخ احمد علی فارسی کے عمدہ شاعر تھے ان کی فارسی نثر و نظم پر مشتمل ایک مجموعہ رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔

اصغر، صاحب زادہ اصغر علی خاں:

صاحب زادہ اصغر علی خاں اصغر نواب غلام محمد خاں کے پوتے اور صاحب زادہ عبدالعلی خاں ظریف کے بیٹے تھے ان کی ولادت ۱۲۳۵ھ میں ہوئی ان کی پرورش بھی دہلی میں ہوئی اور اپنے دوسرے اہل خاندان کے ساتھ ۱۸۴۰ء میں رام پور آگئے۔

دوران قیام دہلی مومن خاں کے شاگرد ہوئے اور اپنے استاد کے انداز سخن کی کامیاب پیروی کی ہے۔ ''انتخاب یادگار'' میں ان کے بعض اشعار بطور نمونہ دیئے گئے ہیں

لیکن انکا ۶۲ صفحات کاایک دیوان رضالائبریری میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے (فن نظم، دیوان ۹۹۸) انہوں نے تقریباً ۳۸ سال کی عمر پائی اور ۱۲۷۳ھ میں وفات ہوئی بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کب یہاں تھا گذر غیر جو رسوا ہوتے
تم نے کس واسطے میرے دل میں آنا چھوڑا

اس نازکی پر اس سے تو ہرگز نہ ٹوٹتا
اصغرؔ وفا کا عہد ہی ناپائیدار تھا

افکارؔ، صاحب زادہ اصغر علی خاں:

یہ نواب احمد یار خاں اصغر کے بیٹے تھے نواب محمد یار خاں امیرؔ بہت مشہور شاعر تھے جو ریاست روہیل کھنڈ کے بانی نواب علی محمد خاں کے بیٹے تھے افکار ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء کو رام پور میں پیدا ہوئے دوسرے اہل خاندان کی طرح شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ انہوں نے رام پور کے اخون زادہ احمد خاں غفلتؔ اور علی بخش بیمارؔ کے علاوہ خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی اور شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی سے بھی فیض اٹھایا تھا۔ تذکرہ ''انتخاب یادگار'' میں ان کے کچھ اشعار دیئے گئے ہیں۔ نمونہ کے بطور ملاحظہ ہوں۔

دے دیا طاق سے آئینہ اٹھاکر ان کو
حال مجھ سے دل حیران کا دکھا یا نہ گیا

قد ہی خود قیامت تھا، زلف کیوں بڑھائی ہے
اور ساتھ محشر کے اک بلا لگائی ہے

تم تو محشر میں نہ ہوگے کہہ دو
ورنہ اک اور قیامت ہوگی

ذکرِ محشر ہو چکا واعظ ذرا اب دل سنبھال
میں بیاں کرتا ہوں اپنے فتنہ ور کی چال کو

آلم، صاحب زادہ محمد سعید اللہ خاں:

محمد سعید اللہ خاں آلم نے شاعری ورثے میں پائی تھی آپ کے والد محمد امداد اللہ خاں تابؔ، دادا کفایت اللہ خاں کفایتؔ، پردادا نصر اللہ خاں سلطانؔ سبھی شاعر ہوئے ہیں۔
آلم ۱۲۴۶ھ میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم ان کے رشتے کے چچا تھے۔ چناں چہ ابتدا میں ناظم کو ہی اپنا کلام دکھاتے تھے لیکن بعد میں عباس علی بیتابؔ کی شاگردی اختیار کرلی تھی۔ آپ صاحب علم وفضل تھے اور نقاشی کا بہت صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔

ان کے خاندان کے اکثر لوگوں کے کلام کا جو حشر ہوا وہی ان کے کلام کا بھی ہوا یعنی چند اشعار پر مشتمل مختصر سا انتخاب امیر مینائی کے تذکرے میں باقی رہ گیا باقی تلف ہوگیا۔

انہوں نے بہت کم عمر پائی صرف ۳۶ سال کی عمر میں ۱۲۸۲ھ میں انتقال ہوا۔
بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم نے تیری زلف و رخ کی یاد میں
روتے روتے صبح کردی شام سے

ہوا رخ ادھر اسکی زلف دوتا کا
بچائے خدا سامنا ہے بلا کا

بیمارؔ، شیخ علی بخش:

شیخ علی بخش بیمارؔ شیخ غلام علی کے بیٹے تھے۔ امیر مینائی نے ۱۸۵۴ء میں بعمر ۶۷ سال انتقال ہونا تحریر کیا ہے جس کی رو سے یہ ۹۰-۱۷۷۹ء میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ لیکن ان کے وطن کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے کچھ نے سنبھل ضلع مراد آباد، کچھ نے آنولہ اور کچھ نے خود بریلی لکھا ہے اسی نسبت سے آپ کو بیمارؔ بریلوی بھی لکھا گیا ہے لیکن شبیر علی خاں شکیبؔ کے مطابق یہ آنولہ ضلع بریلی کے ہی رہنے والے تھے۔

اوائل عمر ہی سے آپ کو شاعری کا چسکا لگ گیا تھا۔ عین جوانی میں لکھنؤ گئے اور وہیں پر غلام ہمدانی مصحفیؔ امروہوی کے شاگرد ہو گئے مصحفیؔ کے انتقال کے بعد بھی وہ وہیں (لکھنؤ) رہتے رہے لیکن جب نواب محمد سعید خاں والی ریاست رام پور ہو گئے تو ان کی فوج کے جنرل حکیم سعادت علی خاں کے اصرار پر انہیں یہاں طلب کیا گیا اور ان کو "بوستان خیال" کے ایک طلسم کا منثور ترجمہ کرنے کا کام دیا گیا جس میں وہ ۱۴ سال لگے رہے اور "طلسم بیضا" کے نام سے یہ داستان لکھی جس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

جب بیمارؔ رام پور آئے تو یہاں احمد خاں غفلتؔ ایک اہم ترین شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ انہوں نے بھی بعض مصلحتوں سے ان کی شاگردی اختیار کر لی حالانکہ خود ان کی عمر اس وقت تک ۵۰ سال کے قریب تھی۔

بیمارؔ کے کلام کے بارے میں صاحب تذکرہ "بزم سخن" (سید علی حزیں) نے جو کچھ لکھا ہے اس کا اردو ترجمہ ہے کہ:

> "ان کے تخیل کا پرندہ گمان سے بھی زیادہ بلند پرواز ہے۔ بیان کی قوت اور زبان وطرز ادا کا لطف اگر میرؔ اور مصحفیؔ سے زیادہ نہیں ہے تب بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان سے کم تر ہے البتہ زمانہ کے اعتبار سے تقدم الگ بات ہے"

لیکن افسوس! انہوں نے اپنے کئی دیوان تیار کرنے کے بعد ضائع کر دیئے اب ان کا ایک دیوان (جو بڑی حد تک نامکمل سا ہے) رضا لائبریری کے مخطوطات میں شامل ہے (نمبر ۹۹۷، نظم الف)

رام پور میں ان کے اہم تلامذہ میں نظاؔم رام پوری، سید احمد علی رسؔا اور صاحبزادہ مہدی علی خاں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

رام پور میں ۱۸۵۴ء میں بعمر ۶۷ سال انتقال ہوا اور یہیں دفن بھی ہوئے۔

نمونہ کلام یہ ہے:

سانس آہستہ لیجیو بیماؔر
ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

--

بیماؔر لے چکے ہیں ابھی تو وہ امتحان
کم بخت پھر وفا کا تجھے حوصلہ ہوا

--

کیا یاس کو روئیں کہ نہ تھی چشم تر ایسی
ہچکی نہ لگی رہتی تھی دو دو پہر ایسی

--

جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی!
دنیا میں تو مانگے نہ ملی موت خدا سے

--

مسجد میں پی شراب، پڑھی دیر میں نماز
بیماؔر کو شعور کسی بات کا نہیں

تسکیںؔ، میر حسین:

"انتخاب یادگار" مؤلفہ امیر مینائی کے مطابق ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے نسبتی اعتبار سے سادات بارہہ کے خاندان سے تھے۔ ابتدائی تعلیم مولانا امام بخش صہبائی سے حاصل کی۔ ابتدا میں اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھاتے تھے بعدہٗ حکیم مومنؔ خاں مومنؔ کے شاگرد ہوئے اوران کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ صاحب تذکرہ "گل رعنا" (عبدالحیٔ رعنا) نے ان کے متعلق لکھا ہے:

> "استاد کی طرز ادا، معاملہ نگاری اور شوخی کو روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح ملا جلا دیا ہے کہ ان کے کلام میں دل آویزی کی شان بڑھ گئی ہے اور مومنؔ خاں کے ساتھ اس طرح ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے کہ اگر ان دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے کلام کو دوسرے کے کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔ (گل رعنا، ص ۳۲۲)

ان کا بیشتر کلام دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رکھا جاسکا البتہ ایک مختصر دیوان کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں جو ہے "فن نظم، نمبر ۹۹۴"

ویسے تو تلاش معاش میں انہوں نے لکھنؤ اور میرٹھ وغیرہ کئی جگہ کے سفر اختیار کیے لیکن بالآخر ۱۸۴۰ء میں نواب محمد سعید خاں جب رام پور کے نواب بنے اور نواب یوسف علی خاں ناظم کو ان کے ساتھ ولی عہد تسلیم کرلیا گیا تو یہ بھی ان کے ساتھ رام پور آگئے۔ چونکہ خود نواب یوسف علی خاں ناظمؔ، مومنؔ کے شاگرد تھے لہٰذا ان کی دربار رام پور میں خوب قدر و منزلت ہوئی۔

تسکیںؔ کے بیٹے میر عبدالرحمٰن آہیؔ تو ان کے استاد مومنؔ سے اس حد تک وابستہ ہو گئے تھے کہ مومنؔ کی ترتیب کا کام بھی آہیؔ نے ہی انجام دیا تھا۔ تسکیںؔ کے دوسرے بیٹے

میر عبداللہ تھے جنہوں نے غمگین تخلص اختیار کیا تھا اور وہ بھی دربار رام پور کی ملازمت سے وابستہ ہو گئے تھے لیکن بہت ہی کم عمری اور عین جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تسکین سے یہ صدمہ برداشت نہ ہو سکا اور اپنے بیٹے کی وفات کے تقریباً دو سال بعد ۱۸۵۲ء میں خود بھی مالک حقیقی سے جا ملے۔ شبیر علی خاں شکیب کے بیان کے مطابق نواب احمد علی خاں رند کے مقبرے واقع موضع مانکار، متصل شہر رام پور مدفون ہیں۔

نواب ناظم سے ان کے تعلقات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بھی غالب کی صحبت سے یقیناً فیض اٹھایا ہو گا لیکن اس کا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں۔ البتہ ان کے بعض اشعار میں غالب کی طرز کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

کوچۂ یار میں ہم نے تسکین
پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد کیا

اے چشم اشکبار ذرا دیکھنے تو دے
ہوتا ہے جو خراب وہ میرا ہی گھر نہ ہو

شب وصال میں سننا پڑا افسانۂ غیر
سمجھتے کاش نہ وہ اپنا رازدار مجھے

حیاؔ، صاحب عالم مرزا رحیم الدین:

یہ صاحب عالم مرزا کریم الدین رساؔ دہلوی کے بیٹے تھے ۱۸۵۵ء میں بعہد نواب یوسف علی خاں ناظم رام پور آئے اور مستقلاً یہیں سکونت اختیار کر لی۔ نواب رام پور کے درباری شعرا میں ان کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ شاعری میں شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے انہوں نے دو دیوان یادگار چھوڑے ہیں اور پانچ بیٹے بھی۔ سب کے سب شاعر تھے جن

میں فدا، داغ کے شاگرد تھے اور باقی چاروں یعنی فہیم، وفا، ضیاء اور رضا خود حیا کے شاگرد تھے۔ ان کے بعض تلامذہ کا ذکر بھی تذکروں میں ملتا ہے۔ جن میں لالہ بلاس رائے قیاس، حسین علی خاں عاجز، دامودر لال رفعت، رام چرن داس ساقی کے نام اہم ہیں۔ ۱۸۸۷ء میں رام پور ہی میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔ نمونہ کلام پیش ہے

الفت بری بلا ہے حیا تجھ سا آدمی
منت کشِ عہد و سر بازار ہوگیا

وائے حال اس کا کہ جس کو مدتیں یوں ہی ہوئیں
تم ابھی گھبرائے دل کی بے قراری دیکھ کر

رسا، میر احمد علی:

آپ کے اسلاف ملتان سے رام پور آئے تھے۔ صاحبزادہ تجمل علی خاں نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا تیسرا اسکول'' میں ان کی سنہ ولادت ۱۸۱۶ء تحریر کی ہے۔ رام پور میں پیدا ہوئے، رسا نے کافی لمبی عمر پائی اور تین نوابوں کا زمانہ دیکھا۔ جب نواب یوسف علی خاں ناظم مسند ریاست پر بیٹھے تو رسا کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی لیکن ان کے بیٹے نواب کلب علی خاں کے دور میں وہ اہم اساتذۂ سخن میں شمار ہونے لگے تھے۔ رسا علی بخش بیمار کے شاگرد رشید تھے۔ اسی طرح ان کا سلسلہ قائم تک پہونچتا ہے۔ صاحب تذکرہ ''خمخانہ جاوید'' نے لکھا ہے کہ

''آپ کے کلام میں متانت، پختگی اور بندش کے علاوہ استادانہ رنگ کی جھلک موجود ہے''

وفات سے کچھ عرصہ پہلے لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہیں ۱۸۷۴ء میں انتقال کیا۔ آپ کے شاگرد مولانا عبدالعلی خاں فروغ۔ نے تاریخ وفات لکھی جو حسب ذیل ہیں۔

تاریخ او نوشت از سیر الم: احمد علی چہ صاحب فضل کمال بود

چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

ہائے نیچی وہ شرم سے آنکھیں
اور حسرت سے دیکھنا میرا

ارمانِ وصل دل سے نکلنا محال ہے
آنسو نہیں کہ دیدہ تر سے نکل گئے

سنیں گے وہ مقرر تیرے دردِ دل کا افسانہ
جگر تھامے ہوئے بیٹھے ہیں اہلِ انجمن اپنا

شب و اندوہ شام ہی سے
میری جان پہونچی لب پر

[illegible] تا سحر ہی جیتا
نہ وہ شرم سار ہوتا

قسمت اس کان ملاحت سے جدا کرتی ہے
کون اب زخمِ جگر پر نمک افشاں ہوگا

کھلا ہے اے رسا باب اجابت
مگر فرصت نہیں مجھ کو دعا کی

صفدرؔ، صاحبزادہ صفدر علی خاں

نواب محمد سعید خاں کے بیٹے تھے لیکن ان کی عمر ابھی چھ برس کی ہی تھی کہ یتیم ہو گئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم نے ان کی پرورش کی۔ فن مصوری خوش نصی اور فن معمہ میں طاق تھے۔ سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا ان کی ایک کتاب فن معمہ پر شائع ہو چکی ہے علاوہ ازیں ایک کلیات بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ انکا انتقال ۱۸۹۳ء میں کلکتہ میں ہوا چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

وائے قسمت بے خودی میں کھو گئی تصویر یاد
دل کے بہلانے کا یہ بھی مشغلہ جاتا رہا

--

صفدرؔ زباں سے رازِ محبت عیاں نہ ہو
دل آشنائے درد ہو لب پر فغاں نہ ہو

--

بہت آشنا ہیں زمانے میں لیکن
کوئی دوست درد آشنا چاہتا ہوں

--

وہ شجر ہوں جس میں ثمر نہیں
وہ صدف ہوں جس میں گہر نہیں

--

وہ سخن ہوں جس میں اثر نہیں
وہ دھن ہوں جس میں زباں نہیں

--

مبتلا پیش از ظہور جلوۂ جاناں نہ تھا
شمع جب روشن نہ تھی محفل میں پروانہ نہ تھا

عزّت، غیاث الدین:

یہ مولوی جلال الدین صدیقی جلال کے بیٹے تھے ان کی ولادت ۱۲۰۰ھ میں رام پور میں ہوئی۔ امیر مینائی نے ۱۸۶۸ء میں ان کی وفات ہونا تحریر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی عمر ۶۸ سال ہوئی۔ انہوں نے علوم متداولہ کی تحصیل اپنے والد گرامی سے کی تھی۔ مولوی غلام جیلانی رفعت سے بھی مستفید ہوئے۔ فارسی شعر گوئی میں عنبر شاہ خاں آشفتہ و عنبر کے شاگرد تھے انہوں نے شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے نواسے مولوی نورالاسلام سے فن طب کی تحصیل کی۔ ان کی اصل شہرت ان کی مشہور فارسی لغت ''غیا اللغات'' کی بناپر ہوئی۔ حالانکہ انہوں نے متعدد کتب فارسی تصنیف یا تالیف کی ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں:

۱۔ منتخب العلوم ۲۔ جواہر التحقیق ۳۔ آمدنامہ فارسی
۴۔ شرح گلستاں موسوم بہ امیر بہاراں ۵۔ منشیات عزت
۶۔ خلاصۃ الانشاء فارسی ۷۔ شرح سکندر
۸۔ قصہ شاہزادہ مہر نظیر و ملکہ ماہ منیر ۹۔ قصۂ گل وگیندا
۱۰۔ شرح مثنوی غنیمت ۱۱۔ شرح بدر چاچ
۱۲۔ خواص الادویہ ۱۳۔ شرح گلگشت ۱۴۔ مجربات غیاثی

غالب نے ملاّ غیاث الدین کی شہرۂ آفاق تالیف ''غیاث اللغات'' کو بطور سند پیش کیے جانے پر غصہ میں آکر بعض نامناسب کلمات کا استعمال کیا تھا کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کو لالہ قتیل کی فارسی دانی سے للّٰہی بیر تھا۔ دوسرے ان کو ممکن ہے کہ ملاّ غیاث الدین کی نوابین رام پور سے قربت اور استادی ناگوار گذرتی ہو کیونکہ غالب کو اپنی فارسی دانی پر

نامناسب حد تک غرور تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس لغت کو میر حسن ندوی لکھنوی نے خود منگوا کر اپنی نگرانی میں اپنے مطبع سے شائع کرایا تھا اور بعد میں سرزمین ایران پر بھی اس کی قدر افزائی ہوئی اور ایک عمدہ ایڈیشن وہاں سے شائع کیا گیا۔ ملاّ غیاث الدین کے متعلق یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور فارسی تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ بطور تفریح طبع اردو اور فارسی میں بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کے بعض اردو اشعار جو تذکروں میں ملتے ہیں پیش خدمت ہیں۔

بے چین کردیا مجھے اک دم میں اس طرح
آنکھوں کو تیری کس نے یہ جادو سکھا دیا

زاہد بھی خانقاہ میں بدمست ہوگیا
کیفی کو میرے نشے میں سرمشار دیکھ کر

اتنی بے مہری تو اے ماہ جبیں خوب نہیں
ہم سے ہر بات میں یہ تیری نہیں خوب نہیں

عنایتؔ، صاحب زادہ عنایت علی خاں:

یہ رام پور کے خانوادۂ شاہی سے تعلق رکھتے تھے نواب غلام محمد خاں بہادر کے پوتے اور صاحبزادہ عبدالعلی خاں کے بیٹے تھے چونکہ نواب غلام محمد علی خاں کی بھی اولادوں کو رام پور سے باہر رہنے پر مجبور ہونا پڑا تھا لہٰذا ان کی ولادت بھی رام پور میں نہیں ہوئی۔ دوران قیام دہلی یہ اپنے دوسرے اہل خاندان کے ساتھ مومن خاں کے شاگرد ہوئے۔ صاحبزادہ عباس علی خاں بیتابؔ جو آپ کے برادر بزرگ تھے وہ بھی مومن خاں کے تلامذہ میں سے تھے۔

عنایتؔ کے والد (صاحبزادہ عبدالعلی خاں) نواب محمد سعید خاں بہادر کے چھوٹے بھائی تھے جب چچا کو انگریزوں کے حکم کے تحت مسند ریاست رام پور پر مامور کیا گیا تو یہ بھی رام پور آ گئے۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کی شادی عنایتؔ کی بہن سے دوران قیام دہلی میں ہو ہی چکی تھی۔ اس لحاظ سے دربار رام پور کی سرزمین میں ان کو بہت عزت و وقار حاصل رہا۔
مومنؔ کے تو یہ شاگرد تھے ہی لیکن رام پور پہونچنے کے بعد اپنا کلام میر حسین تسکینؔ کو دکھالیا کرتے تھے اور فارسی کلام کی اصلاح مولانا امام بخش صہبائی سے لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ صہبائی کی شاگردی اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے مراسم نے ان کی علمی لیاقت اور شاعرانہ کمال کو بہت کچھ نکھارا۔

ان کے دیوان کے جو اوراق امیر مینائی نے مرتب کئے تھے ان کو کسی کاتب نے دوبارہ لکھ کر ایک طرح سے ترتیب دے لیا تھا جو رضا لائبریری میں ''دیوان عنایتؔ'' کے نام سے موجود ہے۔

تقریباً ۳۵ سال کی عمر میں ۱۸۴۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ امیر مینائی ان کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

''آفرینش مضامینِ تازہ کی قوت ہر شعر سے پیدا ہے۔ بذلہ سنجی اور نزاکتِ خیالی کی کیفیت ہر مضمون سے ہویدا ہے''
(ص ۲۳۲)

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

خاموش جلا کرتے ہیں محفل میں کسی کی
یوں شمع کو سکھلاتے ہیں آدابِ فنا ہم

مرا ہی خط کہیں پھر نامہ بر نہ لایا ہو
جوابِ نامہ جو ہوتا تو وا نہیں آتا

اور اب آئی قیامت تو مجھے یاد آیا
دیکھ کر وادیٔ وحشت کو بیاباں اپنا

غربتؔ، صاحب زادہ محمد ہدایت علی خاں:

یہ بھی نواب غلام محمد خاں کے پوتے اور صاحب زادہ عبدالعلی خاں کے بیٹے تھے اور ظاہر ہے کہ نواب یوسف علی ناظمؔ ان کے چچازاد بھائی اور بہنوئی تھے۔ تذکرہ ''انتخاب یادگار'' کی ترتیب ۱۲۹۰ھ کے وقت غربت کی عمر ۶۳ سال تھی جس کی رو سے غربتؔ کی تاریخ ولادت تخمیناً ۱۲۲۷ھ ہے ویسے تو غربتؔ کے استاد مومن خاں تھے لیکن امیر مینائی کے مطابق بعد میں شیخ مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی سے بھی مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

کیں کاوشیں تو ناخن تدبیر نے بہت
عقدہ نہ ایک بھی مری مشکل کا حل ہوا

ثبت رہا نہ عالمِ وحشت میں پیراہن
دامن سیا جو ہم نے گریباں نکل گیا

غمگینؔ، سید عبداللہ:

یہ میر حسن تسکینؔ کے چھوٹے صاحبزادے تھے اپنے والد کے ساتھ رام پور آگئے اور نوابی سرکار میں عملۂ عدالت میں کئی برس ملازم رہے انہوں نے بھی بچپن میں دہلی میں اپنے والد کے استاد مومنؔ خاں کو اپنا کلام دکھایا تھا لیکن رام پور پہونچ کر اپنے والد کو ہی اپنا

کلام دکھاتے رہے عین جوانی میں ۱۸۵۰ء میں راہی ملک بقا ہوئے بطور نمونۂ کلام چند اشعار ملاحظہ ہوں:

امتِ نوح پہ طوفان ہی آیا یارو
شکر یہ ہے وہ مرا دیدۂ خونبار نہ تھا

مجھے تو روز ہجراں کی مصیبت یاد ہے واعظ
کچھ ایسا ہو کہ تیرے دل سے دھڑکا حشر کا نکلے

کمی کریں جگر و دل تو کیا کروں یارب
کچھ اور دے مجھے مژگانِ خونچکان کے لئے

غمگین، عبدالقادر خاں:

ان کو مولوی اور مفتی کے لقب سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ مرزا محمد اکرم آشنا کے صاحب زادے تھے ۱۱۹۵ھ میں رام پور میں پیدا ہوئے تھے انہوں نے ۱۴ برس کی عمر میں تمام علوم کی کتب درسیہ کی تحصیل کرلی تھی، انہوں نے رام پور، مراد آباد اور دہلی کے جید علما سے استفادہ کیا تھا۔ انہوں نے مختلف نوعیت کی ملازمتیں بھی کیں اور مختلف جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے۔ دہلی میں وہ سررشتہ دار کے عہدے پر فائز رہے اور بعد میں مفتی اور صدر امین کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ دوران قیام دہلی ان کے مرزا غالب سے تعلقات ہوئے۔ غمگین کے مزاج میں غالب ہی کی طرح شوخی وظرافت کا عنصر موجود تھا۔ چناں چہ ایک روز غالب سے کہنے لگے کہ آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آیا اور فوراً دو مصرعے موزوں کرکے مرزا کو سنائے۔

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سن کر حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں ہے انہوں نے پھر اصرار کیا تب مرزا

سمجھے کہ انہوں نے دراصل میری مشکل پسندی اور پیچیدگی خیال پر لطیف پیرائے میں اعتراض کیا ہے ویسے مرزا غالب غمگین کی لیاقت علمی کے بہت معترف تھے۔

۱۸۴۰ء میں عدالت دیوانی اور فوجداری میں مفتی کے عہدے پر فائز کیے گئے بعد میں مدرسہ عالیہ کی نگرانی کا کام بھی انہیں کے سپرد کیا گیا۔ ۸ رجب ۱۲۶۵ھ کو انتقال ہوا۔ شبیر علی خاں شکیب کے مطابق ان کا کلیات مرزا مونس برلاس نے پاکستان میں شائع کرا دیا ہے۔

غمگین نے اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی ہے۔ شاعری کے سلسلے میں وہ اپنے والد مرزا محمد اکرم آشنا کے شاگرد تھے نمونہ کلام یہ ہے:

یہ ہے قسمت کی خوبی دیکھ اسے میرے جنازے پر
نمازی اس قدر بھکے کہ اک تکبیر کم کر دی

کیوں کر نہ کروں پیری میں، میں سیر جہاں
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذری کا

کس کی چتون نے مجھے کو مارا ہے
اپنی آنکھوں کا جرم سارا ہے

منصور و علی، سید زین العابدین:

آپ کا اصلی نام سید زین العابدین تھا والد کا نام سید حسن علی تھا۔ آپ حسنی سید تھے اور منصور اور علی دونوں تخلص کرتے تھے ان کا سال پیدائش ۱۸۲۴ء ہے کیونکہ ''انتخاب یادگار'' کی ترتیب کے وقت امیر مینائی نے ان کی عمر پچاس سال لکھی ہے۔ جب آپ تین سال کے تھے تو آپ کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا نانا نے پرورش کی۔ میاں رفیع الدرجات نزہت سے درسی کتابیں پڑھیں تھیں اور شاعری میں بھی انہیں کے شاگرد تھے فارسی اور اردو

دونوں میں شاعری کرتے تھے۔

آپ نے تمام عمر مجرد زندگی بسر کی لیکن صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے اور اسی کے ساتھ اکثر اپنے عالم میں محور ہتے تھے کبھی کبھی جب جذب کے عالم میں ہوتے تو سال سال بھر لوگوں سے ملنے سے پرہیز کرتے۔ ان کے پاس بڑے بڑے اہم لوگ حاضر ہوتے رہتے تھے یہاں تک کہ والی ریاست رام پور بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے مکان تعمیر کرانے کی پیش کش کی لیکن انہوں نے کسی طرح معذرت کر لی۔ ۱۳۰۶ھ میں رحلت کی ان کی تدفین خسرو باغ سے متصل نواب فیض اللہ خاں کے مقربے کے مشرق میں ہوئی۔

ان کے تلامذہ میں نظام علی خاں طیش، عبدالکریم خاں عزیز، مبارک شاہ خاں مبارک، سید حمید شاہ سوز، امتیاز احمد خاں عرف پیارے خاں راز، محمود علی خاں محمود اور محمد علی خاں معجز وغیرہ اہم ہیں۔

حضرت منصور کی تمام فارسی کتابیں اور کلام دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکا کیونکہ ان کا اکثر کلام ان کے عقیدت منداور شاگرد اپنے پاس نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ چناں چہ ان کا کوئی دیوان نہیں ہے البتہ بعض اصحاب کی ذاتی بیاضوں سے منصور کا کلام جمع کر کے ''رسالہ منصور'' کے نام سے ان کے عزیز سید نظر الحسن قادری مرحوم نے شائع کر دیا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

رہبری خضر کی معلوم ہے اس کوچہ میں
میری وحشت مجھے لے جائے تو کچھ دور نہیں

چمن ہوں، رنگ ہوں، بو ہوں، صبا ہوں، خندہ گل ہوں
بنفشہ ہوں، سخن ہوں، لالہ ہوں، نسریں ہوں، سنبل ہوں

موجد، حشمت علی خاں:

آپ محمد سعادت علی خاں طلعت کے بیٹے تھے آپ کے اسلاف کے کارنامے

روہیلوں کی تاریخ میں ایک بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ محمد سر بلند خاں اور محمد عمر خاں آپ کے اسلاف میں سے تھے جنہوں نے روہیلوں کے معرکۂ جنگ بمقام دوجوڑہ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ اپنے اسلاف کی طرح خود موجدؔ بھی ریاست رام پور میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

شاعری میں موجدؔ رام پوری مومن خاں کے شاگرد تھے تاحیات ان سے مشورۂ سخن کرتے رہے اور ان کے بعد کسی دوسرے استاد کو اپنا کلام دکھانا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کا ایک دیوان رضا لائبریری میں محفوظ ہے جس میں بعض قصائد بھی ہیں جو قدماء کی تقلید میں ہیں۔ نمونہ کلام کے بطور چند اشعار لکھے جا رہے ہیں:

دونوں ہاتھوں سے جگر تھام کے رو دیتا ہوں
یاد آتا ہے، کسی کا جو تبسّم مجھ کو

•

کہاں میں اور کہاں ترکِ محبت
نصیحت کی بھی ظالم نے تو کیا کی

تم آئے یا نہیں آئے کہیں سے
نکالو بل کہیں چینِ جبیں سے

اتنی ہی دعا میں مری تاثیر ہو یا رب
جتنا کہ ہر اک بات میں دشمن کی اثر ہے

نحیفؔ، صاحب زادہ محمد مہدی علی خاں:

یہ نواب غلام محمد خاں کے پوتے تھے ان کے والد کا نام صاحبزادہ حفیظ اللہ خاں

تھا گویا کہ یہ نواب یوسف علی خاں ناظم کے چچازاد بھائی تھے ابتدا میں وہ نواب مذکور کو اپنا کلام بغرض اصلاح دکھاتے تھے بعد میں میر احمد علی رسا کے شاگرد ہوئے۔ غزلیات کے علاوہ بعض قصائد بھی تخلیق کیے تھے لیکن ان کا کلام زیادہ تر تلف ہو گیا ہے۔ ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۸۹ھ کو وفات پائی چونکہ آپ کی ولادت ۱۲۲۴ھ میں ہوئی تھی اس لئے آپ کی عمر صرف ۶۷ برس کی ہوئی۔ ''انتخاب یادگار'' میں قصائد کے علاوہ غزلیات کے کچھ اشعار درج ہیں جن میں سے بعض بطور نمونہ یہاں بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔

روز محشر ہوا مشتاق تماشہ عالم
ان کی تصویر مرا نامۂ اعمال ہوا

وہ گرمی نظر سے پسینے میں تر ہوئے
میں غرق ہو گیا عرقِ انفعال میں

گفتگو مجھ سے رہی ہے اس بتِ عیار سے
کچھ نہیں مشکل سوال روز محشر کا جواب

نظام، سید نظام شاہ:

نظام رام پوری سرزمین رام پور کے ایک اہم ترین شاعر گذرے ہیں۔ نظام کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ پرنسپل عبدالشکور صاحب، صاحبزادہ تجمل علی خاں، ڈاکٹر شعائراللہ خاں اور جناب شبیر علی خاں کے علاوہ ڈاکٹر رخسانہ عالم نے ان پر تحقیقی مقالہ بھی پیش کیا ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ مقتدر اہل قلم نے ان کے بارے میں لکھا ہے اس کے علاوہ رام پور سے متعلق بھی قدیم تذکروں میں ان کا ذکر موجود ہے یہ بالکل طے ہے کہ جب غالب رام پور آئے تو نظام یہاں کی بساط سخن پر چھائے ہوئے تھے اور ان کا شمار اہم

شعرا میں ہوتا تھا۔ ویسے تو نظام شیخ علی بخش بیمارؔ کے شاگرد تھے لیکن جب نواب یوسف علی خاں ناظم رام پور واپس آ گئے اور مسند ریاست پر متمکن ہوئے تو انہوں نے نواب موصوف سے بھی استفادہ کیا اور بعد میں اپنے پیرومرشد سید احمد علی احمدؔ سے عقیدت وارادت کے علاوہ زانوئے تلمذ بھی طے کیا۔

نظام رام پوری کی شاگردی کے بارے میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ جن کا تعلق احمدیہ سلسلۂ تصوف سے ہے ان کی شاعری کو میاں احمد علی صاحب کا فیضان نظر تصور کرتے ہیں اور بعض لوگ ان کے کلام کو علی بخش بیمارؔ کا ہی طفیل بتاتے ہیں۔ لیکن شبیر علی خاں شکیبؔ نے انہیں غالب کے اہم شاگردوں میں شمار کیا ہے جس کے ثبوت میں انہوں نے نظام کے اس بیاض قلمی کی رنگین تصاویر بھی اپنی کتاب ''رام پوری دبستان شاعری'' میں شائع کی ہیں جن پر غالب کے ہاتھ کی اصلاحات موجود ہیں لیکن جناب دلدار نصری نے اپنے ایک مضمون مشمولہ رسالہ ''ضیاء وجیہہ'' مئی ۱۹۹۹ء میں اس بیاض مذکور کے استناد کے بارے میں ہی شک وشبہہ کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے جن بزرگوں کا ذکر کیا ان کا تعلق رضا لائبریری سے رہا ہے۔ امیر مینائی، مہدی علی خاں تحویلدار کتب خانہ نجم الغنی خاں، احمد علی خاں شوقؔ، عرشی صاحب تو لائبریری کے منتظم اعلیٰ بھی تھے۔ قدرت رام پوری اور فائق رام پوری کا بہت گہرا تعلق لائبریری سے رہا ہے لیکن کسی کو پتہ نہیں چلا کہ نظام کی بیاض جو لائبریری میں موجود ہے اس پر غالب کی اصلاح ہے۔

بہرحال یہ موضوع خود ایک جداگانہ تحقیق کا متقاضی ہے اس سلسلے میں سبھی صورتوں اور مختلف رایوں کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کن بات کہی جانی چاہیے جو فی الوقت میرا موضوع نہیں۔ یہاں اس مضمون میں غالب کے زمانے کے رام پور کی ادبی فضا کو سمجھنے کی کوشش کی جارہی

ہے۔ جہاں نظام رام پوری بہر حال اس ماحول کے جزو غالب تھے۔

نظام رام پوری کی ولادت ۱۸۲۱ء میں رام پور میں ہوئی تھی ان کے والد میاں احمد شاہ کا شمار شرفاء رام پور میں ہوتا تھا۔ نظام رامپوری نے رام پور کے علاوہ دوسرے مقامات کا بھی سفر کیا جس میں ریاست ٹونک کے سفر کا ذکر ان کے بیٹے سید قیصر شاہ نے کیا تھا لیکن وہ زیادہ مدت وہاں نہیں رہے بقول خود:

رہنے کی ٹونک میں کوئی صورت نہیں نظآم
چلیے کہیں یہاں سے دل اپنا اٹھایئے

نظآم زندگی کے رنگ رلیوں میں بھی شامل ہوئے وہ کانٹھ (مراد آباد) والی چنو طوائف پر کافی ریجھ بھی گئے تھے لیکن پیر و مرشد میاں احمد علی شاہ نے ان کو موصوفہ سے نکاح کی اجازت نہیں دی اور پھر ان کے حال پر ایسی نظر عنایت کی کہ ان کی دنیا ہی بدلتی چلی گئی۔ اکثر یاد الٰہی میں محو رہنے لگے۔ اولاد کی محرومی نے انہیں سنجیدہ شخص بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے آٹھ بیٹے کم عمری میں چل بسے البتہ نویں صاحبزادے حیات رہے۔

نظام رام پوری کے کلام کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد ان کے ناقدین متفقہ طور پر ان کو ایک ادابند، نازک خیال اور منفرد لب و لہجے کا شاعر مانا ہے ان کے کلام سے متعلق نیاز فتح پوری، امیر مینائی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر لطیف حسین ادیؔب، شبیر علی خاں شکیؔب اور ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وغیرہ نے اپنی رایوں کا اظہار کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ایک طرف نظام نے زبان کی سادگی اور صفائی پر اتنا زور دیا کہ لوگ ان کو رام پور کا میر کہنے لگے دوسری طرف اس سادگی میں مومؔن اور غالؔب جیسی سادگی و پرکاری کا بھی اپنے کلام کا غالب عنصر بنایا لیکن بعد میں غالباً اسیر لکھنوی اور امیر مینائی کی روش سے متاثر ہو کر لکھنوی طرز کے اشعار بھی کہے لیکن سب جگہ ان کے لہجے کا تیکھا پن نمایاں ہے بطور نمونہ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ جھروکے سے جھانکیں تو میں اتنا پوچھوں
بستر اپنا پسِ دیوار کروں یا نہ کروں

اٹھتا ہوں جب اس کی بزم سے ہو کے ناامید
پھر پھر کے دیکھتا ہوں کوئی اب پکار لے

دردِ دل کا علاج ہو کس سے
یوں مسیحا ہوا کرے کوئی

تصور آپ کا ہے اور میں ہوں
یہی اب مشغلہ ہے اور میں ہوں

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا تو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

دنیا وہ اسکا ساغرِ مے یاد ہے نظام
منہ پھیر کے اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

نہ بن آیا جب ان کو کوئی جواب
تو منہ پھیر کر مسکرانے لگے

تشخص ہے باعث جدائی کا ورنہ
یہ قطرہ ہم آغوشِ دریا نہ ہوتا

کیوں نہ ہو عرش پر دماغ اپنا
کسی کوچے کی خاک پا ہیں ہم

اسی سبب تو کھنچا ہے عطر مٹی کا
بسی ہوئی ہے زمیں میں جو بوتراب کی بو

نظامؔ کا انتقال محمد علی خاں آثرؔ کے تذکرہ 'حمکدۂ شعر وسخن' کے مطابق ۲۵ رشعبان ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۳ء کو رام پور میں ہوا۔ ۵۰ برس کی عمر پائی اپنے مرشد کے مزار کے گنبد کے جنوبی دروازے کے برابر میں دفن ہیں۔

وزیرؔ، وزیر علی خاں:

وزیر حسن علی خاں کے بیٹے تھے جو کپتان کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ وزیر کی ولادت ۱۲۴۴ھ میں ہوئی۔ بچپن میں دہلی چلے گئے اور وہاں مومن خاں سے استفادہ کرتے رہے۔ وطن واپس آ کر نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہد میں ریاست رام پور کے ملازم ہو گئے اور نواب کلب علی خاں کے زمانے میں بھی ملازم سرکاری رہے۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا رام پور واپس آئے تو امیر مینائی سے مشورہ سخن کرنے لگے لیکن بیشتر کلام ان کی بے اعتنائی کے سبب تلف ہو گیا امیر مینائی نے اپنے تذکرہ میں کچھ اشعار نقل کر دیئے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ان کا کلام امیر مینائی کے دوسرے شاگردوں سے ملتا جلتا ہے۔

ارماں نکال لوں دل حسرت نقیب کے
دو دن کو دے خدا جو مقدر رقیب کا

انکار وصل سنتے ہی اپنا ہوا وصال
بھیجا پیام یار نے، پیک قضا کے ہاتھ

لے گئے رخ دکھا کے تاب وتواں
لٹ گیا دن کو قافلہ دل کا

سطور بالا میں دوزمروں کے تحت ان شعرا کا تذکرہ کیا گیا جن کے متعلق اغلب گمان یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور پر مرزا غالب سے ملتے جلتے رہے ہوں گے اور ان میں سے کافی لوگوں سے غالب کی بھی ملاقات اکثر رہی ہوگی کیونکہ دونوں بار جب غالب رام پور آئے تب وہ الگ مکان میں رہے تھے اور دربار کی حاضری کے علاوہ تقریباً روزانہ خاصا وقت علمی وادبی لوگوں سے ملاقات میں صرف کرتے تھے۔ اس طرح متذکرہ بالا سبھی رامپوری حضرات غالب کے معاصر ہی نہیں بلکہ شناسا کہے جاسکتے ہیں۔

لیکن ان سبھی لوگوں کے کلام کا جس قدر قلیل حصہ تذکروں اور بعض کتابوں کے توسط سے دیکھنے کو ملا اس سے میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ غالب کے طرز خاص کی پیروی یہاں کے کسی شاعر نے نہیں کی ہے البتہ نواب یوسف علی خاں ناظم کے طرز سخن گوئی کا معاملہ اس بات سے مستثنیٰ ہے محض قیاس اور گمان کے تحت اس صورت حال کی درج ذیل وجوہ ہوسکتی ہیں۔

۱۔ متذکرہ بالا شعراء میں ایک بڑی تعداد ان صاحبزدگان کی ہے جن کی غالب تک

رسائی نواب یوسف علی خاں ناظم کے توسط سے ہوئی تھی اور رام پور آنے کے بعد بھی غالب سے ان کی انفرادی ملاقاتیں بہت ہی کم ہوئی ہوں گی کیونکہ یہ سبھی صاحبزدگان عمر، رتبہ اور تعلقات کی نوعیت کے اعتبار سے ناظم سے کم حیثیت کے مالک تھے۔

۲۔ سبھی صاحبزدگان بطور تفنن طبع شاعری کرتے تھے اور سبھی کا مزاج عام رئیسوں اور نوابوں جیسا تھا میرا خیال ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی آبگینۂ ذہن و خیال غالب کی طرح صہبائے تفکر سے پگھل نہیں رہا تھا۔

۳۔ خود غالب کی حیثیت ان نواب زادوں کی نظر میں وابستۂ دولت، وظیفہ خوار سے زیادہ نہیں رہی ہوگی کیونکہ غالب کے متعلق سبھی جانتے ہیں کہ وہ عام ذہنی سطح کے لوگوں میں ہمیشہ عدم مقبول اور پیچیدگی و دشواری کی علامت سمجھے جاتے تھے۔

۴۔ نواب زادگان کے علاوہ جتنے شعرا دربار میں موجود تھے یا کسی اور ادبی اجتماع میں ملتے ہوں گے ان کی بھی ذہنی بلندی کا غالب کی ذہنی نہج کے مماثل ہونے کا بھی امکان کم ہی تھا۔ لہٰذا بعض شعرا نے غالب کی زمینوں پر غزلیں کہی ہیں لیکن وہ اتفاقیہ طور پر ہی غالب کے فکر و رسا اور انفرادی لب و لہجے سے ٹکرا سکی ہیں۔

۵۔ رام پور کے سبھی شعرا عام عاشقانہ لب و لہجے اور داغؔ دہلوی جیسے زبان کے چٹخارے کو ہی سرمایۂ افتخار سمجھتے رہے ہیں اور جو حضرات دہلی اور لکھنؤ سے یہاں آتے رہے ان کا لب و لہجہ کم و بیش رام پوری مزاج سے میل کھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جہاں ایک طرف قائمؔ چاند پوری، قدرت اللہ شوقؔ، مومن خاں، امیر اللہ تسلیم، مصحفیؔ، انشاء اور جرأت، ذوقؔ اور داغؔ دہلوی کو شرف قبولیت حاصل ہوا تو دوسری جانب ناسخؔ، آتشؔ، منیرؔ شکوہ آبادی، امیرؔ مینائی اور ضامن علی جلالؔ

وغیرہ دبستان لکھنؤ کے شعرا کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی دونوں جانب سے ان شعرا کا کلام یہاں پہونچتا رہا یا ان میں سے بیشتر حضرات یہاں کے ہو کر رہ گئے جس سے یہاں کے شاعروں پر ان کے اثرات براہ راست پڑے۔ لیکن چونکہ غالب شاہی خاندان سے زیادہ وابستہ تھے اور عام ادب نوازوں اور سخن وَروں سے ان کے روابط محدود تھے۔ لہٰذا ہر دو جانب اثر پذیری کے مواقع کم سے کم رہے ہوں گے۔

۷۔ رام پور میں اس زمانے میں نوابی دربار کے علاوہ ایسی ادبی مجلسیں ہونے کا ثبوت نہیں ملتا۔ جہاں لوگ بے تکلفانہ طریقے سے ایک دوسرے سے ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوں۔ اگر کہیں ایسا ہوتا تو یا تو غالب کے محققین یا رام پور کے دبستان سے متعلق لکھنے والوں میں سے کسی نے اس بات کا ذکر ضرور کیا ہوتا لہٰذا غالب کو رام پوری معاصرین اور یہاں کے لوگوں کو غالب سے اخذ و استفادہ کرنے کے مواقع کم سے کم ملے ہوں گے۔

۸۔ ہنگامۂ غدر سے پہلے ہی غالبؔ سیاسی اتھل پتھل اور بالآخر کسی ان دیکھے مستقبل سے خائف نظر آتے ہیں۔ انہوں نے نواب یوسف علی خاں ناظمؔ سے سلسلۂ مراسلت جاری رکھا تھا لیکن انہوں نے کئی بار یہ بھی گذارش کی کہ ان کے خطوط کو از راہ عنایت چاک یا تلف کر دیا جائے۔ چناں چہ سرکار کی طرف سے اس گذارش کو قبول کیا گیا اور اکثر خطوط تلف کر دیئے گئے۔ ظاہر ہے کہ غالبؔ ہنگامۂ غدر کے تین سال بعد پہلی بار رام پور آئے تب ارکان سرکار میں سوائے سَیل چند کے کسی اور سے غالب کی ملاقات اور مراسلت کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ منشی سیل چند ریاست رام پور کے آج کی زبان میں چیف سکریٹری تھے جنھوں نے غالب سے ادبی حیثیت سے ملاقات کرنے کی خود خواہش کی تھی۔

ادھر غالب کی بھی ان سے غرض وابستہ تھی کیونکہ نواب یوسف علی خاں ناظم اور بعد میں نواب کلب علی خاں نواب سے وہ بار بار معاشی مدد اور دستگیری کے طالب ہوتے تھے اور باوجود خصوصی مراسم کے نواب موصوف کو تقاضے کا خط نہیں لکھ سکتے تھے لہٰذا وہ بار بار میر منشی سیل چند کے ذریعے اپنا مدعا یا طلب و تقاضہ کرتے رہتے تھے اور شاید غالب کو ان کے علاوہ کسی سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا۔

۹۔ متذکرہ بالا حقائق کے باوصف اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب نواب موصوف غالب کو وظیفے، وقتاً فوقتاً امدادیں، خلعتیں وغیرہ عنایت کرتے تھے۔ غالب نواب ناظم سے تحریر و تقریر میں بے تکلف ہوسکتے تھے ان کے انتخاب دیوان کو سرکاری خرچ پر شاہانہ تزئین و آرائش کے ساتھ مرتب کرایا جاتا ہو اور جن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ نہ صرف نواب ناظم کے شاعری میں استاد ہیں بلکہ ابتدا میں فارسی بھی انہوں نے غالب سے پڑھی ہے تو ظاہر ہے کہ یہاں سبھی ان کی علمی اور سماجی شخصیت سے متاثر ہوئے ہوں گے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یقیناً غالب کی زمینوں پر بھی غزلیں کہیں ہوں گی اور ان کے طرز کلام کی بھی کسی حد تک پیروی کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

چناں چہ ضرورت اس بات کی ہے کہ جن شعرا کو سطور بالا میں غالب کے شاگرد اور معاصرین بتایا گیا ہے ان کے غیر مطبوعہ اور منتشر کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے اور یہ تعین کرنے کی کوشش کی جائے کہ رام پور کے انداز شاعری پر غالب کا کیا اثر پڑا۔

مخطوطہ دیوان کلیات غالب لوہارو کا تنقیدی مطالعہ، رام پور کے تناظر میں

بڑی مسرت کی بات ہے کہ رضا لائبریری رام پور میں ایک بہت ہی نفیس اور نادر فارسی مخطوطہ "دیوان کلیات غالب" ہے۔ دراصل یہ نواب لوہارو کے ذخیرہ کتب میں تھا جب انہوں نے اپنا ذخیرہ رضا لائبریری کو عطا کیا تو یہ مخطوطہ بھی اس کی ملکیت میں شامل ہوا۔ اس نسخے کے متعلق امتیاز علی عرشی صاحب کا بیان ہے کہ اس کے کاتب نواب فخر الدین خاں ہیں اور سرِ ورق پر نواب الٰہی کی ۱۸۷۵ء کی تحریر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن کے پاس اسی سنہ میں پہنچا ہے۔ جہاں تک تحریر کا سوال ہے تو سرِ ورق پر نواب الٰہی نہیں بلکہ "علاء الدین احمد خاں علائی ۱۸۷۵ء" مرقوم ہے۔ اس کا سائز ۱۸×ساڑھے ۲۸ اور فہرست نمبر ۲۹ ہے۔

نواب علاء الدین احمد خاں علائی نوابِ اوّل امین الدین احمد خاں والی لوہارو

کے فرزند ارجمند تھے اور علائی تخلص کرتے تھے۔ امین الدین احمد خاں، عفنو الدولہ محمد وزیر بیگ رسالدار اودھ کے داماد تھے۔ علائی کی پیدائش ۴ر ذی الحجہ ۱۸۳۳ء کو دہلی میں ہوئی۔ والدہ کا نام ولی النساء بیگم تھا۔ علائی غالب کے بہت ہی چہیتے شاگرد تھے اور ان کے کہنے پر بھی غالب فکرِ سخن کرتے تھے۔ علائی نے اردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اُن کا فارسی کلام اردو سے زیادہ ہے۔ غالبؔ نے انہیں سند عطا کر کے اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا اور اُن کو کبھی ''میری جاں'' اور کبھی ''مرزبانِ لوہارو'' کہہ کر پکارتے تھے۔ نواب فخر الدین علی خاں غالبؔ کے پسندیدہ کاتب تھے۔ مخطوطہ ہذا خوبصورت نستعلیق میں مطلا اور مذہب الواح کا حامل ہے۔ مذکورہ حقائق کے پیش نظر یہ ایک گرانبہا مخطوطہ ہے قطعات سے پہلے نثری عبارتیں بطور عنوان موجود ہیں جن سے مطالب کی وضاحت ہوتی ہے حاشیوں پر متعدد قطعات و فردیات بخطِ غالب مرقوم ہیں۔

مخطوطہ مذکورہ کے ورق ب ۴۸ پر مثنوی باد مخالف کے بعد ''فاتحہ'' کے عنوان سے غالب کی ۱۴۵ اشعار کی نظم ہے جس کا پہلا شعر ہے:

بہر ترویجِ جناب والی یوم الحساب۔ ضامنِ تعمیر شارستانِ دلہای خراب یہ نظم کلیات غالب لاہور ایڈیشن (مرتبہ غلام رسول مہر) میں قطعات کے ذیل میں آئی ہے لیکن زبان و بیان اور عناصر ترکیبی کے لحاظ سے یہ قصیدہ ہے کیونکہ قصیدہ اور قطعہ میں مطلع مصرّع ہی تمیز قائم کرتا ہے۔ قصیدے کی ایک خاص زبان ہوتی ہے جو اسے دیگر اصناف سے ممیّز کرتی ہے۔ بطور دلیل اس کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

جرم بخشای کہ گر جوشد بہار رحمتش
برفنای خویش لرزد چون دلِ مجرم عذاب
نوح عمری ماند طوفانی بہ بحرش سطوتش
تاسرِ زانو بموجی باخت مانند حباب

سایہ ارش جز در رحیم قدس نتواں یافتن
کز شکستِ رنگ امکان عصمتش دارد نقاب

بہر ترویج جنابی کز نہیب عصمتش
صیقلِ آیینہ برنورِ نگہ ریزد حجاب

بہرِ ترویج امام رہنمای انس و جان
عابد اللہ معبود خلایق بو تراب

اس قصیدے میں حضرت علی اور دیگر ائمہ کرام وشہدائے عظام کی مدح بہت ہی شان وشکوہ اور جوش وزور کے ساتھ ہے۔ اس میں موسیقیت وترنم اور جذبات کی لہریں شباب پر ہیں۔ مذکورہ قصیدہ کے بعد "فاتحہ" ہی کے عنوان سے ایک دوسری نظم ۲۰ اشعار پر مشتمل ہے اور قطعہ شمار کی گئی ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق یہ بھی قصیدہ ہے۔ اس کا مطلع ملاحظہ کریں:

بہرِ ترویج نبی، حاکمِ ادیان و ملل — کار فرمای نبوت ابداً ہم زازل
بہرِ ترویج گلِ روضۂ جنت زہراؓ — قبلۂ آلِ رسول است و امامِ اوّل
بہرِ ترویج حسن چشم و چراغِ آفاق — کہ چنالش دہد آیینۂ جان را صیقل
بہرِ ترویجِ حسین آنکہ دو چشمِ جبریل — از پی سرمۂ خاکِ درش آمد مکمل

یہ قصیدہ بھی نعتِ رسول اور منقبت ائمہ کرام پر مبنی ہے۔ اس میں بھی وہی زور وشان وشکوہ ہے یہ عرفی کے مشہور قصیدہ "چہرہ پردازِ جاں رخت کشد چوں محمل" کے تتبع میں کہا گیا ہے۔ عرفی کے کسی بھی قطعہ میں مطلع مصرع نہیں ہے۔ اب آخر کے دعائیہ اشعار نذر ہیں:

درحقِ غالب بیچارہ دعای کہ دگر — نکشد دردِ سرِ تاب وتبِ طولِ امل
شاد شادان بہ نجف بال کشاید کہ شود — گردِ آن بادیہ از بہرِ صداعش صندل
بر رود زین تنِ خاکی بفضای ارواح — فارغ از کشمکشِ سطوتِ مریخ و زحل

مذکورہ حقائق کے مدِّ نظر اگر ان دونوں قطعات کو قصیدہ شمار کر لیا جائے تو غالب کے فارسی قصیدوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔

''کلیات دیوان غالب'' لوہارو میں ایک بہت ہی معرکتہ الآرا قطعہ ہے جو لکھنؤ (نول کشور) اور لاہور (غلام رسول مہر) والے مطبوعہ کلیات میں نہیں ہے اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

نواب بفکر ارمغانست تا نامہ فرستدت بسامان

اس قطعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مختلف اہم اصحاب وممالک، متعدد شہروں اور ان سے متعلق مشہور اشیاء کا بیان ہے۔ اس طرح یہ بہت ہی معلوماتی قطعہ ہے اس میں غالب کی جدت وندرت اور وسعتِ معلومات آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں چند اشعار تبرکاً نذر ہیں:

دیبا ز دمشق و مخمل ز روم الماس ز معدن و زر زکان
فیل از دکن و زمرد از کوہ تو سن زعراق و دُرّ زعمان
فیروزۂ نغز از نشاپور یاقوتِ گزیدہ ازید خشان
جمازہ تیز رو ز بغداد شمشیر برندہ از صفاہان

دو چار اشعار کو مستثنٰی کر کے ایسا التزام پورے قطعہ میں ہے۔ اندازہ قوی ہے کہ یہ قطعہ بخطِ غالب ہے۔

مخطوطہ زیر بحث میں ورق ۱۹۲ الف کے حاشیے پر غالب کا ایک خمسہ ہے جو قدسی کے مشہور لغت کی تضمین میں ہے۔ اس کے متعلق عرشی صاحب سبدِ باغ دودر میں رقمطراز ہیں۔ ''یہ خمسہ سبد ۱ و ۲ دونوں میں نہیں ہے مگر عرصہ ہوا کہ اسی غزل پر دوسرے بہت سے خمسوں کے ساتھ ایک مجموعہ ''حدیث قدسی'' میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے''۔

خمسۂ مذکورہ کلیات غالب فارسی مہر اور کلیات غالب نولکشور میں نہیں ہے۔ اسی

ورق پر غالب کا ایک طویل قیصدہ ''در منقبت علی مرتضیٰؓ و واجد علی شاہ'' کے عنوان سے ہے۔ مجموعۂ قصائد و مثنویات فارسی [۲۳] میں اس کا عنوان صرف ''قصیدہ در مدح واجد علی شاہ'' ہے۔ یہ قصیدہ ۷۶ اشعار پر مشتمل ہے ابتدائی اشعار منقبت علیؓ اور حسبِ حال سے متعلق ہیں کچھ اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کریں:

ابو لائمہ ولی علی کہ از ذاتش — دلیل ختم نوبت بہ ہشت و چار کشد

جلیس ناقہ سواری کہ پیش وی جبریلؑ — پیادہ رہ رودُ وناقہ را مہار کشد

انیس راہ نمای کہ در رہش در خلد — بود چو چشم کسی باز کا انتظار کشد

ورق ۲۴ الف حاشیے پر بخطِ غالب ایک قطعہ درج ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے:

ہزار و دوصد و ہشتاد و دو شمار کنید

بحسبِ ضابطہ از ہجرتِ رسول اللہ

یہ قطعہ غالب نے نواب کلب علی خاں کو بطور معذرت تحریر کیا ہے۔ اس کے اشعار سے تاریخ تحریر کے سال، ماہ و دن وغیرہ کی بھی نشاندہی ہوتی ہے:

امیرِ کلبِ علی خان بہادر از رہِ لطف

بسوی غالب خونین جگر کنند نگاہ

کہ این فلک زدہ گر عرض کرد مصلحتی

بزعم بندہ ز اخلاص بودار ناگاہ

خلاف طبع مبارک افتادہ آن تقریر

بسی خطا رود از بندگانِ دولت خواہ

تو بادشاہ، و شہنشاہ تاجدار فرنگ

خطاب میکلبد بادشاہ ز شاہنشاہ

اسی مخطوطے میں ایک قصیدہ نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کے جشن سے متعلق ہے مرزا

غالب نے اس جشن میں شرکت کی تھی اور یہ قصیدہ دربار میں سنایا تھا۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

تا چہ نیرنگ است این کاندر جہان آوردہ اند
نو بہاری طرفہ در فصلِ خزان آوردہ اند

مجموعہ قصائد و مثنویات فارسی (مرتبہ مہر) اور مخطوطہ لوہارو میں درج ذیل شعر مختلف واقع ہوا ہے:

کزنی خم دادہ قوسش سطح گردوں برجای سعد اکبر است
نی کہ خود سازند و خود نامش کمان آوردہ اند

(مخطوطہ لوہارو، ورق ۱۰۴)

دیگر آن زرین سلب خورشید منظر پالکی
کزنی خم دادہ قوسش درمیان آوردہ اند

مجموعہ قصائد و مثنویات مرتبہ مہر)

مجموعہ قصائد و مثنویات میں اس کے بعد ہی یہ شعر ہے:

قوس کآن بر سطح گردون جای سعد اکبر است
نی کہ خود سازند و خود نامش کمان آوردہ اند

مخطوطہ ہذا میں ایک تاریخی قطعہ نواب کلب علی خاں کی شادی اور دو سال کی خشک سالی کے بعد تشفی بخش بارش کی مبارکباد سے متعلق ہے۔ اس قطعہ میں غالب نے موسمِ برسات کی نوازشوں کا بیان، نواب یوسف علی خاں، نواب کلبِ علی خاں اور شہر رامپور کی مدح بڑے ہی دلنشین و والہانہ انداز میں کی ہے۔

پس از دو سال بر اہلِ جہان مبارکباد — بہار ہند کہ نازند برشگال آنرا
سحاب و سبزہ و آب راون مبارکباد — باغ و دشت و بیابان و کوہ سرتاسر
ز جاں بتن از تن بجان مبارکباد — گذشت عہدِ سموم و وزید باد خنک

قطعہ مذکورہ کے درج ذیل اشعار میں غالب کا استفہامیہ انداز، پر توضیح قابل تعریف ہے

معاف باشم اگر خود ز خویشتن پرسم　　　برامپور خصوصاً حسپان مبارکباد

زبرگ برگِ نیستان کہ گرد آنشہر است　　　رسد بگوش چنان کز زبان مبارکباد

تیسرے شعر میں رامپور کی جغرافیائی تصویر بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ شہر کے چاروں طرف نیستان کا منظر اور پھر پتے پتے سے غالب کو مبارکباد کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس شعر میں نیزوں (نرکلوں) کی شخصیت پردازی Personification خوب ہے۔ اس قطعہ میں نواب کلب علی خاں صاحب کی مدح، ان کی شخصیت اور کارناموں کے شایانِ شان ہے۔

مخطوطہ کی اندرونی جلد (سرِ ورق سے پہلے) عرشی صاحب نے کچھ اشارے اشعار کے بقلم غالب ہونے کے متعلق، تحریر کیے ہیں۔ ان اشاریوں میں صفحات کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ انہوں نے ورق ۱۵۳ کے حاشیوں کی بات کی ہے جبکہ اس کے حاشیے سادہ ہیں۔ البتہ ورق ۱۵۰ کے حاشیے پر یہ شعر بخطِ غالب مرقوم ہے:

باز شوقم در خروش آوردہ است

باز ہوی ہم چو مستان می زنم

ورق ۱۷۸ کے حاشیہ کا فرد یہ ہے:

نازم آن فتنہ کہ دردشت بہ غمخواری قیس

لیلیٰ از ناقہ فرو آید و محمل برود

عرشی صاحب نے ورق ۲۳۰ کی بات کی ہے تو ورق دو سوتیں نہیں بلکہ درج ذیل اوراق کی غزلیں بخط غالب معلوم ہوتی ہیں۔

۲۲۶ (حاشیہ)

۲۲۷ الف و ب

۲۲۸ الف و ب

۲۲۹ الف و ب

ورق ۲۵۷ کے حاشیے پر ایک رباعی بقلم غالب ہونے کی نشاندہی عرشی صاحب نے کی ہے تو ۲۵۷ کے حاشیے پر رباعی نہیں بلکہ بقلم کاتب غالب کا مخمس بر لغت قدسی ہے۔ مندرجہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ مخطوطہ بہت ہی اہم ہے اور خصوصاً اس لحاظ سے بھی کہ اس میں رامپور اور نوابین رامپور کے متعلق ایسے قطعات ہیں جو دوسرے مطبوعہ نسخوں میں نہیں ہیں لہٰذا اس کی اشاعت سے غالبیات میں اہم اضافہ ہوگا۔

ماٰخذ

۱۔ گنجینہ غالب، ص ۱۵، پبلکیشنز ڈویژن، دہلی

۲۔ سبد باغ دودر، ص ۴۰، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو کراچی

۳۔ مجموعہ قصائد و مثنویات فارسی، ۳۶۳، مرتبہ غلام رسول مہر مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسی، لاہور ۱۹۶۹ء

۴۔ دیوان کلیات غالب لوہارو، خطی نمبر ۲۹، مخزونہ رضا لائبریری رام پور

عتیق جیلانی سالک

دارالسرور میں غالب

رام پور کو غالب نے بیت العمور ودارالسرور کہا ہے۔ اور دہلی کو ستم آباد، جب کہ ان کی زندگی کا زیادہ حصّہ دہلی میں گزرا۔ جہاں سے انہیں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بہادر کا خطاب بھی ملا تھا۔

غالب دہلی کی گلیاں چھوڑ کر رام پور کیوں آئے اور پھر زیادہ کیوں نہیں رکے۔ اس کے محرکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دہلی میں ان پر مے کشی، قمار بازی، مخبری، دھوکہ دہی اور بغاوت تک کے الزامات لگے۔ ان کے اشعار بھی قابلِ اعتراض تھے۔ جن میں مذہبی عقائد کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ مثلاً جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ایسی جنّت کا کیا کرے کوئی۔۔اور۔۔ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود + پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے۔

اس کے علاوہ والی فیروز پور جھرکہ ولوہارو نواب شمس الدین خاں سے خاندانی پنشن پر نزاع تھا۔ نواب پر قتل کا مقدمہ چلا تو غالب پر مخبری کا الزام لگا اور لوگ ان کو گالیاں لکھ کر بھیجتے تھے۔ جس پر غالب نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ بھی قایم کیا تھا۔

اس زمانے میں نواب غلام محمد خاں معزول والیٔ ریاست رام پور کے فرزندگان محمد سعید خاں و محمد عبداللہ خاں دہلی ہی میں رہتے تھے۔ جب محمد سعید خاں کو والیٔ ریاست مقرر کیا گیا تو محمد عبداللہ خاں نے غالب کو مشورہ دیا کہ تہنیتی قطعہ لکھ کر بھیجیں۔ اس وقت تو غالب اپنی پنشن کی وجہ سے نہ آسکے۔ مگر بعد میں اس کی سبیل نکل آئی۔ نواب محمد سعید خاں کے بعد یوسف علی خاں مسند نشین ہوے۔ انہوں نے غالب سے فارسی کے چند اسباق پڑھے تھے۔ ادھر رام پور میں مولوی فضل حق خیر آبادی نواب صاحب کے مشیر تھے۔ انہوں نے مرزا غالب کا کلام سنا کر انہیں رام پور بلانے کا مشورہ دیا۔ اور مرزا صاحب بڑے اعزاز کے ساتھ تشریف لے آئے۔ یہاں انہیں عیش و عشرت اور فارغ البالی کی ایسی دولت میّسر آئی کہ وہ اپنی پرانی روش پر دوبارہ گام زن ہو گئے۔ ان کے خیالات رام پور کے بارے میں نہایت تعریفی تھے۔ خطوط میں احباب کو لکھتے ہیں کہ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے گو کہ قیام رام پور صرف دو ماہ رہا۔ اس دوران انہوں نے اپنے دیوان کی نئی ترتیب اور طباعت کی طرف بھی توجہ دی۔ مگر زین العابدین خاں کے دونوں بیٹوں باقر علی خاں و حسین علی خاں کی وجہ سے دہلی واپس جانا پڑا۔ حالانکہ رام پور رہنے میں ان کی تنخواہ دو سو روپیہ اور باہر جانے پر سو روپے مقرر ہوئی تھی۔ دہلی واپس جانے پر بھی نواب یوسف علی خاں سے ان کے کلام پر اصلاح کے علاوہ دیگر امور پر خط و کتابت رہی۔ بلکہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد بہت کچھ سیاسی مسائل بھی تھے جن کے بارے میں مرزا غالب کی ہدایت تھی کہ ''بعد ملاحظہ چاک خط سرد با جائے۔''

رام پور میں قیام کے دوران دربار کے علاوہ یہاں کے علما سے بھی گہرے مراسم رہے بعض امور میں اختلاف رائے بھی ہوا۔ اُس وقت خلیفہ شیخ احمد علی احمد فارسی کے منتہی نواب کلب علی خاں و نواب مشتاق علی خاں کے استادوں میں تھے۔ مرزا غالب رام پور آئے تو اثنائے گفتگو میں کلام عرفی پر شیخ صاحب نے تنقید کی۔

ساکتم، ایں نغمہ تا در نیم شب ہمرہ مرغ سحر خوان می زنم

شاہدی کو، کہ کا یک نقش گوشے بدلِ درد پرور اندازد

جواب میں غالب نے بہت کچھ کہا مگر فیصلہ نہ ہوسکا اور طے پایا کہ باقی گفتگو رات کو ہوگی۔ کسی وجہ سے مرزا صاحب نہ آسکے اور انہوں نے اپنے دلائل تحریری طور پر لکھ کر بھیج دیئے۔ احمد علی شوق نے تذکرہ کاملان رام پور میں مندرجہ ذیل شعر لکھ کر تحریر کیا ہے کہ بحث میں شیخ صاحب غالب آئے۔

من کہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب

مرغ توصیفِ توازواج بیاں انداختہ

حضرت مولانا عرشی مرحوم نے اس پر لکھا ہے کہ مذکورہ بالا دو شعروں کے ساتھ یہ تیسرا بھی معرض بحث میں آیا ہوگا۔ ورنہ میرزا صاحب خط میں اسی کا ذکر کرتے۔

مکاتیب غالب نسخہ عرشی میں غالب کا ایک اور خط ہے جس میں احمد علی صاحب کو لکھا ہے کہ فقیر شب کو آپ کو منتظر رہا۔ اس خط میں فارسی مرادفات اور قواعد کی بحث ہے۔ مگر اس میں بھی عرفی کے دونوں اشعار کی واضح طور پر حمایت کی گئی ہے۔ بلکہ اس کے کلام کو سند مانا گیا ہے۔

نواب یوسف علی خاں کی وفات کے بعد ان کے ولی عہد کلب علی خاں مسند نشین ہوے۔ تو غالب کا خیال تھا کہ وہ اپنے سنّی عقیدے میں پختہ ہونے کے باعث ان کی پذیرائی زیادہ نہیں کریں گے۔ اس لیے ایک قطعہ میں فرماتے ہیں:

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں

حیدرآباد دکن، رشکِ گلستانِ ارم

رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر

کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوے ہیں باہم

نواب کلب علی خاں کی خوش نودی کے لیے ایک دوسرے مکتوب میں تحریر کیا۔

''رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور کہ ہے

مرجع و مجمع اشرافِ نژادِ آدمؑ''

غالب اہالیانِ رام پور سے بھی بے حد گھلے ملے تھے۔ ان کی علم دوستی اور شعر فہمی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

> شہر کا حال یہ کہ ذوقِ شعر گوئی و شعر فہمی کا جو پایہ میں نے یہاں پایا۔ جمیع اہلِ ہند کو بھی میسر نہ آیا۔ رام پور کہاں ہے۔ اس باب میں روکش شیر آز و اصفہان ہے۔ ہر شخص شعر کا فریفتہ، شعر ہر شخص پر فریفتہ۔

عہد نواب کلب علی خاں میں رام پور میں انہیں راجدوارہ والی حویلی کے بجائے قلعہ کے نزدیک جرنیل کوٹھی میں ٹھہرایا گیا۔ جو توسیعِ قلعہ کے وقت قلعہ میں آ گئی ہے۔ اپنے احباب کو لکھے خطوط میں انہوں نے نواب صاحب کی بے انتہا تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ نواب صاحب حسنِ اخلاق میں نواب فردوس مکاں آرامگاہ (یوسف علی خاں) کے برابر بعض شیوہ و روش میں ان سے بہتر ہیں۔

اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نواب یوسف علی خاں میں جس طرح سیاست اور دیگر معاملات اردو شاعری میں تلمذ وغیرہ میں ان کا دخل رہتا تھا۔ وہ نہیں رہا۔ نواب کلب علی خاں قابلیت کے معترف ضرور تھے۔ فارسی نثر میں اصلاح کے خواست گار بھی تھے۔ مگر جیسا کہ مالک رام نے ''تلامذۂ غالب'' میں لکھا ہے۔ پہلی ہی اصلاح پر بحث چھڑ گئی۔ نواب نے اپنی فارسی نثر میں ''آشیاں چیدن'' کو ''آشیاں بستن'' کے معنی میں لیا تھا۔ جسے غالب نے مسترد کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ ''ارتنگ وارژنگ'' کے مرادف وغیرہ مرادف ہونے پر بھی بحث چل پڑی تھی۔ جب نواب نے عرفی کی شرح اور

غیاث الدین کی غیاث اللغات کا حوالہ دیا تو غالب نے انہیں حیض کالتہ قرار دے دیا۔ جب کہ مولوی غیاث الدین نواب صاحب کے استاد تھے۔ انہیں غصہ تو بہت آیا۔ مگر پی گئے اور خیر سے غالب کا وظیفہ بند نہیں کیا۔ بعد میں غالب نے بہت کچھ معذرت کی اور لکھا کہ

بقصرِ دولتم مانی وارژنگ

طراز سحر می بستند برسنگ

اس موقع پر نواب کلب علی خاں کے ضبط کی تعریف کرنا پڑے گی۔ انہوں نے اپنے مکتوب میں تواضعاً لکھا کہ "میں آپ سے نسبتِ تلمذ رکھتا ہوں۔۔۔ اس کے جواب میں غالب نے تحریر کیا۔

یہ دوکان بے رونقِ خریداری ہے۔ میں تو حضور کو اپنا استاد، اپنا مرشد، اپنا آقا جانتا ہوں۔ اب پیرو مرشد نے لکھا ہے کہ ارتنگ وارژنگ متحد المعنی ہیں تو میں نے بے تکلف مان لیا۔ نہ لغت نویسوں کے قیاس کے بموجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ:

"جس شخص کی رگ گردن اس قدر سخت ہو کہ ہندستان کے تمام فارسی ادیبوں سے خسرو کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکتی تھی اور وہ فیضی اور ابوالفضل جیسے باکمالوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ کلب علی خاں کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکاتا تھا کہ میں خداوند نعمت کا حکم مان لیا اور اپنی تحقیق سے باز آیا۔

ان تمام خوشامدوں اور قصیدہ خوانیوں کے باوجود مرزا غالب کو برے دن دیکھنا تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے۔ ریاست سے قرض کی ادائیگی۔ حسین علی خاں کی شادی اور ملازمت کے لیے کوشش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بعد وفات ان کی بیوہ امراؤ بیگم نے ایک خط میں لکھا۔

مرزا صاحب آٹھ سو کے قرض دار مرے۔ وفات کے ساتھ گورنمنٹ اور ریاست رام پور دونوں کے وظیفے بند ہو گئے۔ نواب امیر الدین خاں والی لوہارو کے مطابق نواب ضیاء الدین خاں نے قرض داروں سے کچھ رقم معاف کرائی۔ اور کچھ اپنے پاس سے ادا کی۔ بلکہ لوہارو سے کچھ رقم امراؤ بیگم کو ہر مہینے ملنے لگی۔

دوسری جانب عرشی صاحب نے ''مکاتیبِ غالب'' میں لکھا ہے کہ وفات سے ایک گھنٹہ پہلے ریاست رام پور کا وظیفہ مل گیا تھا۔ بلکہ چھ سو روپے بھی مزید روانہ کیے گئے اور ان کے متبنیٰ حسین علی خاں کو ۲۵ روپے کی ملازمت بھی ریاست میں دی گئی۔

ان حالات میں ان کا یہ شعر کتنا صادق آتا ہے:

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں دیوانِ غالب نسخہ عرشی، مکاتیب غالب نسخہ عرشی اور خطوطِ غالب مرتبہ خلیق انجم، رام پور کا جشنِ بہار مرتبہ رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مسرت حسین آزاد

غالب اور رامپور

یوں تو غالب کا کئی درباروں اور امیروں سے علمی وادبی اور اقتصادی طور پر تعلق رہا ہے۔ ریاست لوہارو سے ان کا رشتہ کا تعلق تھا لیکن ریاست رامپور سے ان کے تعلق کو اکثر محققین غالب نے بطور خاص موضوع بحث بنایا ہے اور نئے نئے پہلو نکالنے کی کوشش کی ہے آج اس مواد کی خاص اہمیت محسوس کی جارہی ہے اور ایسا خیال ہے کہ اس سلسلے میں کچھ گوشے ابھی تک غور طلب ہیں۔ غالب غدر کے دو ایک سال بعد نواب یوسف علی خاں ناظم کے استاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں غدر سے قبل یا غدر کے زمانے کا غالب کا کوئی ایسا خط نہیں ملتا کہ جس سے پتہ چلے کہ اس وقت بھی نواب سے ان کا کسی طرح کا کوئی تعلق تھا اور جن حضرات نے کسی قدر شک کا مظاہرہ کیا ہے وہ ثبوت میں کوئی مثال پیش نہ کر سکے لیکن یہ ضرور ہے کہ رامپور اور یہاں کے کچھ اہل علم سے وہ واقف ضرور تھے نواب یوسف علی خاں ناظم کو شاگرد بنانے سے کوئی ۳۳ سال قبل وہ مولوی عبدالقادر غمگین رامپوری سے خوب واقف تھے۔ مولوی غیاث الدین کی لغت سے بھی اچھی طرح باخبر تھے اور یہ پہلو بھی بہت

واضح ہے کہ نواب علامہ محمد خاں اور ان کے خاندان کے افراد کی جلاوطنی کے بعد اس خاندان نے دہلی ہی کو اپنا جائے مسکن بنایا تھا، نواب محمد سعید خاں نے وہیں تعلیم حاصل کر کے کمپنی بہادر کی ملازمت اختیار کی تھی اور ان کے فرزند اکبر یوسف علی خاں نے تو گویا بچپن اور جوانی کا خاصہ بڑا حصہ وہیں گزارا تھا، وہیں تعلیم حاصل کی وہیں شاعری کا ذوق ان میں پیدا ہوا اور مومن خاں مومن کی شاگردی اختیار کر کے مشاعروں میں شریک ہونا شروع کیا۔ غالب کے عروج کا بھی وہی زمانہ تھا کوئی باور نہیں کر سکتا کہ دونوں ایک دوسرے سے بے خبر تھے اگر یوسف علی خاں کو غالب کی شاگردی اختیار کرنا ہوتی تو وہیں غالب کی شاگردی اختیار کر سکتے تھے اس لیے ایسا گمان ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں نے بعد میں غالب کی شاگردی انہیں مالی دشواریوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے حاصل کی ہوگی۔ غالب کا اس طرح دربار رامپور سے تعلق قائم کرانے میں مولانا فضل حق خیر آبادی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے غالب کے خطوط سے غالب کی جو آپ بیتی مرتب کی ہے اس میں رامپور کے دوسفروں کی تفصیل اس طرح دی گئی ہے کہ پہلا سفر ۱۹/جون ۱۸۶۰ء سے شروع ہو کر آخیر مارچ تک رہا اور دوسرا ۱۷/اکتوبر ۶۵ء سے ۸/جنوری ۶۶ء تک رہا۔ دونوں مرتبہ یہاں کے اہل علم حضرات سے بھی غالب کی ملاقاتیں رہیں کچھ خطوط سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے مگر بعض اہم باتیں محض روایت کی حد تک آج تک مشہور ہیں۔

غالب سے رامپور کا تعارف نواب یوسف علی خاں کی غالب کی شاگردی اختیار کرنے سے تقریباً ۳۵ سال قبل سے تھا اور اس سلسلہ میں عبدالقادر غمگین کا نام خاص طور پر سامنے آتا ہے کیونکہ غالب اپنی پینشن کے مقدمہ کے تعلق سے جب اگست ۱۸۲۶ء میں کلکتہ گئے ہیں اور وہاں قیام کے دوران ان کے فارسی کلام پر اعتراضات کی وجہ سے ادبی معرکہ شروع ہوا ہے تو غالب نے اپنے ایک خط میں بنام چودھری عبدالغفور واقعہ کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ یہ فارسی مثنوی مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی عبدالقادر چیف

رامپوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی کے پاس بھیجی تھی اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال ادھیڑ ڈالتے۔

غالب کے قیام رامپور کے زمانے کے کئی قصے جو ایک زمانے سے روایتوں میں محفوظ چلے آ رہے تھے ان میں اس بات کا اضافہ ہوا ہے کہ غالباً سید نظام شاہ نظام رامپوری بھی غالب کے شاگرد تھے اور بعض محققین رامپور کو اس بات کا شک غالباً نظام کے کلام میں غالب کے رنگ کی بعض غزلیں دیکھ کر پیدا ہوا ہو اور اتفاق سے نظام کی بیاض کے جو رضا لائبریری میں محفوظ ہے کچھ شعروں پر اصلاح کو غالب کا قلم تصور کر کے نظام کو بھی غالب کا شاگرد تسلیم کر لیا گیا، یہ ایسی ہی بات ہے کہ جیسے سید نظام شاہ نظام کے نام کو سید زکریا شاہ نظام ثابت کرنے کی کوشش کی۔

غالب نے نوابین کے علاوہ رامپور کے کچھ دوسرے اشخاص کو بھی خطوط لکھے ہیں۔ خلیفہ احمد علی احمد رامپوری ساکن محلہ بنگلہ آزاد خاں کے نام غالب کا جو خط تھا وہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے مدرسہ عالیہ کے فارسی استاد مولوی عبدالحکیم خاں سے ۲۵ روپے میں خرید لیا تھا جو مکاتیب غالب مرتبہ مولانا عرشی میں موجود ہے۔ مولوی محمد حسن خاں مالک مطبع حسنی و اخبار دیدبۂ سکندری کے نام بھی غالب کے کئی خط مکاتیب غالب میں موجود ہیں یہ خطوط مولانا عرشی کو غالباً شاہ فضل حسن صابری سے ملے ہوں گے ان میں ایک خط کا پس منظر بڑا ہی دلچسپ ہے۔ غالب نے یہ خط مولوی محمد حسن خاں کو اس وجہ سے لکھا تھا کہ انہوں نے غالب کی پنشن سے اخبار دیدۂ سکندری کے چندے میں دس روپے وضع کرا لئے تھے غالب کو سو کے بجائے نوے روپے موصول ہوئے تو انہوں نے اس کی وضاحت چاہی اور جب اصل بات علم میں آئی تو غالب نے طیش میں آ کر یہ خط لکھا ملاحظہ ہو:

"آپ کا خط تھا یا جھوٹ کی پوٹ بیشتر مجذوب کی سی بڑ اور جو

کچھ سمجھ میں آیا وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ یہ غلط محض ہے کہ مطبع
حضور کا ہے اور تم مہتمم ہو حضور کی طرف سے اللہ اللہ ڈگی جے
سنگ کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ کہیں سارا ایک ورق سیاہ
کرتے ہو اور اپنے والی ملک اور اپنا بادشاہ یعنی امیر المسلمین
نواب کلب علی خاں کے نام کے آگے یا نام سے پہلے کوئی دو تین
لفظ تعظیم کے لکھتے ہو بس اس سے معلوم ہوا کہ تم طرح طرح سے
اطراف و جوانب سے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو میں یکم
جنوری سے ۱۸۶۸ء سے سکندری کا خریدار نہیں ہوں نہ بھیجا کرو
واسطے خدا کے نہ بھیجا کرو"۔۔۔۔۲۵ر فروری ۱۸۶۸ء

یہی وہ خط ہے جس کے بارے میں قومی زبان کے اگست ۹۴ء کے شمارے میں ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ایک مضمون بعنوان "غالب کے تین خط" شائع ہوا اس میں مضمون نگار آغا محمد حسین خاں کو مالک دیدیہ سکندری محمد حسن خاں کا بیٹا بتایا ہے حالانکہ غالب کے اس خط سے اس طرح کی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن نے اس مضمون میں یہ وضاحت فرمائی ہے کہ یہ خط مکاتیب غالب کے چوتھے ایڈیشن میں موجود ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔

مکاتیب غالب میں مولانا محمد علی جوہر کے والد علی بخش خاں کے نام بھی غالب کا ایک خط موجود ہے جو ۶ر جولائی ۱۸۶۰ء کا ہے اور اہم ہے۔

غالب کے رامپوری شاگردوں کی فہرست مالک رام صاحب کے علاوہ کلب علی خاں مرحوم نے بھی دی ہے اس میں ایک شاگرد کا اضافہ جدید تحقیق کے مطابق کیا جا سکتا ہے محمد رضا علی خاں عاقل جو صاحبزادہ محمود علی صاحب مرحوم پرائیویٹ سکریٹری نواب حامد علی خاں کے والد تھے اور محلہ راجدوارہ کے ساکن تھے آپ نے اپنے والد اور دادا کا کلام

''دیوان اصغر مع دیوان عاقل'' نام سے ۱۹۲۵ء میں نظامی پریس بدایوں سے طبع کرایا اس
سے پتہ چلا کہ عاقل نے پہلے غالب کے ایک شاگرد مرزا قربان علی مالک سے اصلاح لی اور
مالک کے انتقال کے بعد غالب کی شاگردی اختیار کی عاقل کے مختصر دیوان میں زیادہ تر
غزلیں اور نواب کلب علی خاں کی شان میں قصائد ہیں متفرق اشعار سے ایک نمائندہ شعر
ملاحظہ ہو:

قتل کرتا ہے اک نگاہ میں وہ
اور ابھی دیکھنا نہیں آتا

میں رامپور کے اہل قلم کا بھی خصوصی حصہ شامل ہے۔ اس موضوع پر ابھی جم کر کام نہیں ہوا
ایک سرسری جائزہ کے مطابق ایسا اندازہ ہوا کہ غالباً رامپور میں غالب پر اولین لکھنے والوں
میں حافظ احمد علی شوق کا نام سرِ فہرست ہے آپ کا ایک مقالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے
اپریل اور مئی ۱۹۲۲ء کے شماروں میں ''سراج الدین ظفر اور مرزا غالب کی زندگی کا ایک
گمشدہ ورق'' قابل ذکر ہے۔ عشرت رحمانی نے بھی ۱۹۴۰ء میں غالب پر ایک کتاب لکھ کر
شائع کر دی تھی۔ محمد علی خاں اثر، شاد عارفی اور کلب علی خاں فائق کی تحریریں بھی غالبیات
میں بطور اضافہ یادگار رہیں گی۔ تاہم مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا کام غالب کی شخصیت کو
منانے سنوارنے میں اپنی الگ لیک شان رکھتا ہے، اس سلسلے میں مرحوم کا گراں قدر تحقیقی
سرمایہ جو غالب کے فن و شخصیت کے گوشوں پر کم و بیش پچاس مقالوں اور مکاتیب غالب،
فرہنگ غالب، انتخاب کلام غالب نسخہ رامپور جدید ۱۸۵۵ء اور دیوان غالب (نسخہ عرشی)
جیسی کتابوں پر محیط ہے ہر دور میں غالب نوازوں کے واسطے مشعلہ راہ ثابت ہوتا رہے گا۔
غالب پر حالی نے لکھ کر حق شاگردی ادا کیا، عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنے مخصوص
اسلوب میں مختصر لکھ کر منفرد حیثیت اختیار کی اور ان تین ناموں نے تو گویا غالب کی شخصیت
اور فن کو عروج کی انتہائی مدارج تک پہنچا دیا مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور مالک رام یہ

تینوں حضرات اب دنیا میں نہیں ہیں۔ قاضی صاحب کے بیٹوں میں باپ کے نقش قدم پر کوئی نہیں چلا مالک رام صاحب کے خاندان سے بھی گویا علم وادب رخصت ہو چکا ہے مولانا عرشی کے فرزند اکبر عرشی زادے کچھ دور تک والد کے نقش قدم پر ضرور چلے ہیں مگر وہ جلد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ عرشی زادہ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ غیر ادبی کاموں میں گزرا تاہم وہ اپنے پیچھے جس قدر بھی سرمایہ تحقیق غالب کے بارے میں چھوڑ گئے ہیں وہ بھی مرحوم کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے بہت کافی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق غالب پر عرشی زادے کے بیس مضامین رسائل کے اوراق میں نظر آتے ہیں غالب کے دیوان کا ابتدائی نسخہ بخط شاعر عرشی زادے کو ملا جسے انہوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ ایڈٹ کیا۔ آج علمی و ادبی حلقوں میں وہ نسخہ عرشی زادہ کے نام سے مشہور و معروف ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ ایسے تلخ حقائق بھی وابستہ ہو گئے ہیں کہ جو ہمیشہ ان کے نام وکام کی اہمیت کو ہمیشہ گھٹاتے بڑھاتے رہیں گے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ تحقیقی اصول کی روشنی میں کوئی محقق عرشی زادے کے غالب واقبال پر کیے گئے کاموں کو مشکل ہی سے نظر انداز کر سکے گا۔

رامپور سے غالب کے شعری رشتوں کو اجاگر کرنے والا ایک پائے کا نام ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر بیدار رضا لائبریری میں بھی لائبریرین کی حیثیت سے چند سال رہے ہیں لیکن آپ نے خدا بخش لائبریری کے جرنلوں کے شماروں کے ذریعہ غالب پر بڑا وقیع مواد مہیا کرا دیا ہے، غالب پر آپ نے اس وقت قلم اٹھایا جب اس کی ضرورت محسوس کی گئی اسی وجہ سے ان کے ذریعہ دریافت شدہ سرمایہ کو بہر حال قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا یہ بات خوشی کی ہے کہ موصوف نے ابھی قلم رکھا نہیں ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اپنے اعصاب پر ہمیشہ غالب ہی کو سوار رکھیں۔

غالب او رامپور یا رامپور اور غالب عنوان کے تحت جن دوسرے رامپوری حضرات نے کچھ لکھا ہے ان کا تفصیلی ذکر طوالت کا باعث ہو سکتا ہے اس لیے سرِ دست دو

ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے آج سے تیس بتیس سال قبل کراچی، پاکستان کے اخبارِ جہاں کے ۲۶ رفروری ۱۹۶۹ء کے شمارے میں نورالصباح مرحومہ کا ایک مضمون اسی عنوان کے تحت شائع ہوا تھا جو اپنی اچھوتی معلومات کی بنا پر وہاں کے ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوا۔ حکیم محمد حسین خاں شفا کا مضمون بھی چند سال قبل اسی عنوان کے تحت اخبارات میں شائع ہوا اور اس کے مطالعہ سے اہم بات یہ سامنے آئی کہ غالب کی کئی تصانیف دربار رامپور کے مالی تعاون سے طبع ہوئیں اور غدر کی تباہی سے محفوظ بھی رہیں، مزید یہ کہ قاطع برہان کا وہ نسخہ جو غالب کے مطالعہ میں رہا تھا رضا لائبریری میں موجود ہے لیکن حکیم صاحب نے ڈاکٹر مدثر عارف کے مضمون کا حوالہ دے کر استاد و شاگرد کے رشتہ کو جو ایک نیا موڑ دینا چاہا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کی دلی خواہش خود بھی غالباً یہی تھی کہ نواب یوسف علی خاں اور غالب کا تعلق شعروشاعری کے ساتھ سیاسی بھی ہوتا اور غالب ایک مخبر کی حیثیت سے نواب صاحب کے تنخواہ دار بن کر بہادر شاہ ظفر کے دربار کی خفیہ باتیں یا دہلی کے سیاسی حالات سے نواب صاحب کو باخبر کرتے رہتے۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب کو نواب یوسف علی خاں نے خوب خوب نوازا۔ نواب یوسف علی خاں تو شیعہ تھے ہی غالب کا عقیدہ بھی مائل بہ شیعیت تھا۔ تعلقات کی دوسری وجوہ کے ساتھ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ نواب کلب علی خاں سنی العقیدہ تھے اور مولوی غیاث الدین کے شاگرد تھے غالب نے مولوی غیاث الدین کا غیاث اللغات کے سلسلے میں جو لمات ادا کیے تھے نواب کلب علی خاں کے کانوں میں وہ ہمیشہ گونجتے رہے پھر بھی انہوں نے باپ کی طرف سے غالب کو دیے گئے وظیفہ کو جاری رکھا اسے ان کی وسیع النظری ہی کہا جا سکتا ہے، رامپور میں غالب کی قیام گاہ دریافت تو کر لی گئی لیکن اندازہ ہے کہ غالب کو اگر یہ بات معلوم ہوتی کہ قیام گاہ سے متصل ہی مسجد میں ملا غیاث الدین کی قبر بھی ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ وہاں رہنے سے انکار کر دیتے اور یوں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نواب یوسف علی خاں انہیں

رہنے کے لئے خورشید منزل سے آدھے کلومیٹر دور مکان دیتے اور بالفرض محال اگر اسی مکان کو غالب کی قیام گاہ تسلیم کرلیا جائے تو یہ ۱۸۶۰ء کی بات ہے۔ پانچ سال بعد جب دوسری مرتبہ آئے اور دو ڈھائی ماہ تک یہاں رہے تب ان کا قیام کہاں رہا یہ بات بھی غور طلب ہے۔ کچھ عرصہ سے یہ بات بھی سننے میں آرہی ہے کہ مولانا عرشی نے غالب کے جو خطوط مرتب کیے تھے ان کی اصل لائبریری میں موجود نہیں۔ اصل میں غالب کے خطوط کا یہ فائل دارالاشاعر میں محفوظ تھا وہیں سے مولانا عرشی تک پہنچا اور امکان ہے کہ مولانا عرشی نے کام مکمل ہونے پر اس فائل کو واپس کردیا ہوگا۔ بعد میں بعض اسکالروں نے ان خطوط کو لائبریری میں دیکھا اور ان سے استفادہ بھی کیا یہ انکشاف مزید شکوک پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ مولانا عرشی نے مکاتیب غالب میں نوابین کو لکھے گئے خطوط کے علاوہ بھی کچھ خطوط اس میں شامل کیے ہیں۔ ایک خط تو مولانا نے ۲۵/روپے میں خریدا تھا۔ اس کے علاوہ دبدبۂ سکندری کے مدیر سے انہیں کچھ خطوط ملے تھے اور ایک خط مولانا محمد علی جوہر کے والد کے نام بھی ایک خط ہے۔ آخر یہ خطوط تو دارالانشاء کی ملکیت نہ تھے انہیں تو لائبریری کے ریکارڈ میں ہونا ہی چاہیے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ بات طے کہ مولانا عرشی نے ۲۵/روپیہ میں ذاتی طور پر خط خریدا ہوگا اور دوسرے خطوط کو بھی انہوں نے لائبریری کی ملکیت میں نہ دے کر ذاتی سرمایہ میں محفوظ رکھا ہوگا۔

اب جب یہ راز سامنے آیا ہے کہ خطوط غالب لائبریری میں نہیں ہیں تو اس پر مزید بحث کا سلسلہ چل سکتا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں اسی قدر عرض کرنا تھا آخر میں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہے کہ ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی او۔ ایس۔ ڈی رضا لائبریری کے ذریعہ اب تک لائبریری کو جو شہرت ملی ہے اور یہاں جو کام ہوا ہے خصوصاً سمیناروں کی شکل میں اس سے مقامی اور بیرونی اہل قلم کو کافی فائدہ پہنچا ہے اس لیے بغیر کسی تردید کے باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ دور لائبریری کی تاریخ میں ایک سنہری باب کی حیثیت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

مرزا غالب۔رام پور کی خانقاہ احمدیہ میں

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ جب رام پور میں پہلی بار تشریف لائے تو انہوں نے یہاں پچاس روز قیام کیا۔ ۲۷؍جنوری ۱۸۶۰ء کو وہ رام پور پہنچے اور ۱۷؍مارچ ۱۸۶۰ء کو رام پور سے روانہ ہوئے۔[۲]

پچاس روز کا عرصہ آج سے ۱۴۳؍سال قبل کسی چھوٹی ریاست میں گذار لینا کم نہیں ہوتا، چنانچہ اس طویل عرصہ میں جہاں ایک طرف وہ والی ریاست نواب یوسف علی خاں ناظم کے دربار میں حاضر ہوتے رہے وہیں دوسری جانب دیگر عمائدین شہر سے بھی وہ ملتے رہے، کیا شعرا اور کیا ادبا سبھی نے غالب سے ملاقاتیں کیں۔ فارسی کے مشہور رام پوری استاد خلیفہ شیخ احمد علی احمؔد سے ملاقات اور استفادۂ علمی کا ثبوت مکاتیب غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم میں موجود ہے۔[۳] علاوہ ازیں رام پور عمائد سے کثرتِ ملاقات کا ذکر غالب کے بیشتر خطوط میں موجود ہے۔ اپنی مشغولیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ازبسکہ یہاں کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں، فرصت مشاہدۂ اوراق نہیں ملی[۴]۔"

اتنی مصروفیت کے بعد اپنے قیام کے آخری ایام میں انہوں نے معلوم کیا کہ ریاست میں اب کوئی باکمال ایسا تو نہیں رہا جس سے میری ملاقات نہ ہوئی ہو۔ حالات مشائخ کے مولف مولانا سردار شاہ خاں لکھتے ہیں:

"بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر مرزا غالب رام پور آئے اور بڑے بڑے ارباب علم وفن سے انہوں نے ملاقتیں کیں۔ رام پور سے روانہ ہونے سے قبل انہوں نے لوگوں سے معلوم کیا کہ کوئی صاحب کمال رام پور میں ایسا تو باقی نہیں رہا جس سے میری ملاقات نہ ہوسکی، لوگوں نے کہا کہ ہاں ایک جلیل القدر عالی مرتبت بزرگ اور بلند پایہ شاعر حضرت شاہ احمد علی خاں صاحب قدسرہ ہیں ان سے آپ کی ملاقات نہ ہوسکی۔ انہوں نے پوچھا آپ حضرات نے میری ان سے ملاقات کیوں نہیں کرائی؟ لوگوں نے کہا چونکہ وہ گوشہ نشین بزرگ ہیں اس لیے ان سے آپ کی ملاقات نہ ہوسکی"[۵]۔

اس اقتباس کے بعد ضرورت ہے کہ حضرت شاہ احمد علی خاں احمؔد کے بارے میں کچھ عرض کردیا جائے۔ شاہ احمد علی خاں احمؔد کے حالات رام پور کے تمام معروف تذکروں میں مل جاتے ہیں امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں ان کے مختصر حالات اور اردو وفارسی کا نمونۂ کلام دیا ہے[۶]۔ حافظ احمد علی خاں شوقؔ نے "تذکرہ کاملان رامپور" میں ان کے قدرے تفصیلی حالات لکھے ہیں[۷]۔ قلمی تذکرہ خم کدۂ شعر وسخن مولفہ محمد علی خاں اثؔر میں احمؔد رامپوری کے حالات کے ساتھ ان کے کلام کے تفصیلی نمونے اور شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے[۸]۔ حالات

مشائخ جسے رام پور کے ایک عالم دین مصنف مولانا سردار شاہ خاں وجہی نے لکھا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۹۷۵ء میں تالیف ہوا اور ۱۹۸۳ء میں اشاعت ہوئی اس تذکرہ میں احمدؔ رام پوری کے مفصل حالات اور باطنی کمالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مذکورہ ماخذ کے مطابق احمد علی خاں احمدؔ کو رام پور میں میاں احمد علی شاہ احمدؔ کہا جاتا تھا، ان کے والد کا نام مولوی مصری خاں آفریدی تھا جو شاہ جہانپور سے ترکِ سکونت کر کے رام پور آ گئے تھے یہیں پر ۱۸۰۹-۱۰ء کے لگ بھگ حضرتِ احمد کی پیدائش ہوئی۔ کُل تعلیم رام پور میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کی تکمیل نامور مصنف اور شاعر امام الدین خاں انورؔ (متوفی ۱۲۵۵) سے کی یہ زمانہ ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔

احمدؔ رام پوری کا شمار انیسویں صدی کے ریاست رام پور کے مایہ ناز شعرا میں ہوتا ہے لیکن انہوں نے گوشہ نشینی کے سبب زندگی گمنامی میں بسر کی۔ بقول محمد علی خاں اثرؔ

"آپ نے اپنے کلام کو اپنے حالات کی طرح ہمیشہ پوشیدہ رکھا"[9]۔

لیکن اتنی گمنامی کے باوجود آج بھی احمدؔ رام پوری کے کلام کے چار مجموعے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں، ایک نسخہ بعنوان ناصر نامہ پٹنہ کی مدرسہ سلیمانیہ لائبریری میں اور دو دیوان مدرسہ فرقانیہ رام پور کی لائبریری میں موجود ہیں۔ رامپور میں محفوظ دیوان بنام افضل نامہ میں تقریباً گیارہ ہزار اشعار موجود ہیں۔ احمدؔ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد علی خاں اثر لکھتے ہیں:

"(احمد نے) اٹھائیس مشہور جنگوں میں سے پانچ جنگیں مختلف رعایتوں کی پابندی کے ساتھ لکھ کر میدان سخن کو اتنا تنگ کر دیا ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کو بھی قدم اٹھانے کی ہمت

نہیں ہو سکتی۔ حضرت احمدؔ کا یہ خاص کارنامہ ہے جو اپنی نظر آپ ہے''۔[۱۱]

احمدؔ رام پوری کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں فارسی زبان کے ساتھ ساتھ عربی پر بھی عبور تھا۔ زیادہ تر کلام عارفانہ شاعری پر محیط ہے جس میں تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال ہوا ہے۔ زبان سادہ ہے جسے ہم سبکِ ہندی کا اعلیٰ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

ذیل میں احمدؔ کے فارسی اور اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

بسوزِ سینۂ و صدقِ نیازم — کہ در عشقت بآتش می گدازم

اے ترک نازک خوئے من گاہے نظر برمن فگن — وے شاہِ بے مثل زمن گاہے نظر برمن فگن

فریاد کہ دل بُرد زمن غنچہ دہانے — شیریں سخنے قند لبے سحر بیانے

جادو نگہے کج کاہے ناز خرامے — نازک کمرے سیم برے لالہ رخانے

دریا درِ رخ زلفِ وے احمدؔ شب و روز است — بانالۂ و آہے و سرشکے وفغانے

--

وہ جانے کی جس دم سنانے لگے — یہ سنتے ہی ہم تو ٹھکانے لگے

ستانے میں اُن کے جو کچھ لطف ہے — کسی وہ کو کیوں ہم بتانے لگے

اگر چھپ سکے تجھ سے احمدؔ چھا — ترے پاس ظاہر و آنے لگے

ہجر میں تیرے ہے مجھ پر بار اٹھنا بیٹھنا — یاد آتا ہے ترا ہر بار اٹھنا بیٹھنا

تیری بدنامی ہے اس میں اور مرا ٹوٹے ہے دل — ہر جگہ اچھا نہیں دلِ دار اٹھنا بیٹھنا

ان مثالوں سے احمدؔ کی شاعرانہ قادر الکلامی کا خاصہ اندازہ ہو سکتا ہے زبان و بیان پر ایسا عبور رکھنے والا شاعر اور وہ بھی گوشۂ گمنامی کا ساکن! ایسے باکمالوں کی تلاش آسان نہیں ہوتی۔

رام پور میں حضرت احمدؔ کی ذاتی رہائش گاہ بازار مٹن گنج میں محلّہ کھیر حاجی کبیر میں

واقع تھی جو جامع مسجد کا عقبی حصہ ہے عرف عام میں اسے میاں احمد علی شاہ کی خانقاہ احمد یہ مجددیہ کہا جاتا تھا آج کل اس میں شمالی ہندوستان کی معروف درس گاہ مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ واقع ہے جب خانقاہ کا ذکر آیا ہے تو یہ وبھی واضح کر دیا جائے کہ احمؔد رام پوری کا سلسلہ طریقت کیا تھا۔

احمد علی خاں احمؔد مرید وخلیفہ اپنے مرشد امام الدین خاں انوؔر کے اور امام الدین خاں بیعت تھے حضرت شاہ درگاہی محبوب الٰہی (متوفی ۱۲۲۶ھ) کے اور شاہ درگاہی صاحب کے مرید وخلیفہ تھے سیدنا حافظ شاہ جمال اللہ نقش بندی مجددی (متوی ۱۲۰۹ھ) کے، حافظ شاہ جمال اللہ کی درگاہ رام پور میں مرجع خلائق ہے۔ شاہ جمال اللہ مرید وخلیفہ تھے شاہ قطب الدین محمد اشرف حیدر حسین (متوفی ۱۱۸۰ھ) کے اور قطب الدین صاحب مرید وخلیفہ تھے شاہ محمد زبیر مجددی سرہندی (متوفی ۱۱۵۴ھ) کے اور شاہ محمد زبیر نے اپنے والد خواجہ محمد نقش بند مجددی سرہندی (متوفی ۱۱۱۴ھ) سے خلات پائی تھی اور خواجہ محمد نقش بند خلیفہ تھے خواجہ محمد معصوم مجدی سرہندی (متوفی ۱۰۷۹ھ) کے اور خواجہ محمد معصوم مرید وخلیفہ ہیں اپنے والد اور مصلح وقت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی (متوفی ۱۰۳۴ھ) کے۔ اس طرح حضرت احمؔد سلسلۂ قادریہ نقش بندیہ میں حضرت مجدد الف ثانی سے واسطہ رکھتے ہیں۔

احمؔد رام پوری کے مرید وخلیفہ رام پور کے مشہور ادابند شاعر سید نظام شاہ نظام رام پوری (متوفی ۱۲۸۹ھ) تھے جن کا یہ شعر سبھی نے سنا ہوگا:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

جب تلاش ہوئی کہ حضرت احمد جیسے گوشہ نشین باکمال فنکار سے غالب کی ملاقات کون کرا سکتا ہے تو سب کی نظر نظاؔم رام پوری پر پڑی۔ بقول صاحب حالات مشائخ

”مرزا غالب نے کہا اِن (حضرت احمدؔ) سے ملاقات کی کوئی صورت ہو سکتی ہے! لوگوں نے کہا میاں سید نظام شاہ صاحب کے ذریعہ ممکن ہے اس لیے کہ وہ ان کے مرید خاص اور خلیفہ ہیں اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں.... چنانچہ مرزا غالب کی درخواست پر حضرت نظام شاہ علیہ الرحمۃ نے ملاقات کا انتظام کرا دیا اور اپنے ہمراہ لے کر حضرت اقدسؒ کے درِ دولت پر حاضر ہوئے۔ غالب نے حضرت (احمد) سے درخواست کی کہ حضرتِ والا اپنا کلام سنائیے۔ حضرت قدس سرہ نے کلام سنانے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے وہ مسودے غالب کے سامنے رکھ دیے جو اِن ایام میں گلستان حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی تضمین کے سلسلہ میں زیرِ قلم تھے۔ غالب اِسے پڑھ کر محوِ حیرت ہو گئے اور کہنے لگے حضرت آپ نے تو دونوں کلاموں کو ایسا ہم آہنگ کر دیا ہے کہ علیحدہ علیحدہ دونوں کلاموں کو پہچاننا دشوار ہے۔ حضرت اقدس نے بھی غالب سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی۔ غالب نے حضرت کی فرمائش پر اپنا کلام سنایا اور دادِ تحسین حاصل کی۔ غالب اس ملاقات اور مختصر سی صحبت سے بے حد متاثر ہوئے جب اپنی قیام گاہ پر واپس آئے تو کہنے لگے اگر حضرت شاہ احمد علی خاں صاحب جیسے باکمال بزرگ سے میری ملاقات نہ ہوتی تو یہ میری بہت بڑی بدقسمتی کی بات ہوتی“[۱۱]۔

اب حضرت احمدؔ کی تصنیف کردہ تضمین گلستانِ سعدی کا رنگ بھی تھوڑا سا دیکھ

لیا جائے کہ انہوں نے کس طرح نثر کے ایک ٹکڑے پر نثری تضمین کی ہے اور شعر پر شعری تضمین۔

حکایت اول

از احمد رام پوری	از سعدی شیرازی
در کتاب گلستاں ای حکایت زیدم	بادشاہے را شنیدم
کہ اُو ہمہ نیکی ونکوئی را عمارت کرد	بکشتن اسیر بے بیگناہے اشارات کرد
اسیر چوں وقتش اخیرا نگاشت	بیچارہ در حالت نومیدی بزبانے کہ داشت

از احمد	از سعدی شیرازی
پیداز قیافہ کم گزندی	بالائے سرش ز ہوش مندی
رخشندہ چو مہ ہمہ پسندی	می تافت ستارہٗ بلندی[۱۱]

غالب اور حضرت احمد کے درمیان جو ملاقات ۱۸۶۰ء میں ہوئی اس کا ثبوت صرف یہی ایک مآخذ ہے جو ہمیں حالات مشائخ سے معلوم ہوتا ہے۔ حالات مشائخ کے مولف سردار شاہ خاں اور راوی خطیب اعظم مولانا وجیہ الدین احمد خاں وجیہ رام پوری (۱۹۸۷۔۱۸۹۹ء) ہیں۔ مولانا وجیہ الدین احمد خاں تک اِس ملاقات کی روایت ان کے استاد اور مرشد مولانا وزیر محمد خاں وزیر رام پوری (۱۹۲۵۔۱۸۶۲ء) کے ذریعہ پہنچی تھی اور مولانا وزیر محمد خاں کے والد خان محمد خاں عاجز رام پوری (متوفی ۱۸۹۹ء) اِس ملاقات کے عینی شاہد تھے اور حضرت احمد کے مرید وخلیفہ بھی تھے اس طرح یہ روایت دو واسطوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے اور یہ دونوں راوی نہایت معتبر اور ثقہ شخصیت ہیں۔

چونکہ احمد رام پوری کے کلام کے مجموعوں کے عکس جمع کیے جا رہے ہیں جو علی گڑھ اور پٹنہ میں ہیں اور غالباً بخط مولف بھی ہیں اس لیے امکان ہے کہ ان مجموعوں کے حاصل ہونے کے بعد اس ملاقات کی تفصیل پر کچھ اور داخلی شواہد میسر آئیں۔

ایک المیہ یہ بھی ہے کہ غالب کے وہ رام پوری خطوط اب نہیں ملتے جن سے عرشی صاحب نے استفادہ کیا تھا اور مکاتیب غالب کی شکل میں انہیں عام وخاص کے لیے ارزاں کر دیا تھا۔ نہ معلوم وہ چیزیں کہاں گئیں اسی طرح ریاست رام پوری کا پولٹیکل ریکارڈس میں آفس انضمام ریاست کے وقت جب ختم ہو رہا تھا تو اُس وقت دارالانشاء کے ڈپٹی سیکریٹری سید شوکت علی صاحب مرحوم نے تجویز پیش کی تھی کہ تمام اہم مواد رضا لائبریری میں محفوظ کر دیا جائے اِس مواد میں ہی غالب کے تمام خطوط بھی تھے۔ بادشاہ دہلی محمد شاہ ثانی اور علی محمد خاں اور داؤد خاں کے درمیان مراسلت کے اصل خطوط بھی تھے اس کے علاوہ ان مشاہیر کے خطوط اور درخواستیں بھی تھیں جو مختلف اوقات میں دربار رام پور سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے تھے۔ یہ تمام مواد رضا لائبریری میں نہ رکھ کر الہ آباد آرکائیوز میں بھجوا دیا گیا جہاں آج تک اس کے بستے دیمک اور دھول چاٹ رہے ہیں۔

میں دست بستہ درخواست کرتا ہوں اپنی جانب سے اور آج کی محفل کے تمام حاضرین کی جانب سے بجناب ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی افسر بکار خاص رضا لائبریری کہ وہ اس مواد کو جلد از جلد رام پور منتقل کرالیں تاکہ تلاش وجستو میں آسانی ہو اور علم وادب کے ساتھ تاریخ وثقافت کے پوشیدہ گوشے منظر عام پر آسکیں۔

ماخذ:

۱۔ مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، صفحہ ۸۴۔
۲۔ ایضاً، صفحہ ۹۰۔
۳۔ ایضاً، ۱۱۷۔
۴۔ اردوئے معلی، صفحہ ۷۳۔
۵۔ حالات مشائخ مولف سردار شاہ خاں، صفحہ ۱۵۴
۶۔ انتخاب یادگار مولفہ امیر مینائی، صفحہ ۱۰۔۹

۷۔ تذکرہ کاملان رام پور مولفہ احمد علی خاں، شوق، صفحہ ۲۶
۸۔ اس قلمی تذکرہ کے منتشر اوراق محمد علی خاں آثر رام پوری کے صاحبزادے عثمانی علی خاں شوق اثری ساکن گھر مجھ خاں رام پور کے پاس محفوظ ہیں۔ تذکرۂ مذکور کا بڑا حصہ کراچی میں مشفق خواجہ صاحب کے ذخیرہ میں موجود ہے۔ میں نے اُس سے استفادہ کیا ہے۔ شائر اللہ خاں
۹۔ مضمون احمد رام پوری از آثر رام پوری مشمولہ آج کل دہلی جنوری ۱۹۵۶ء
۱۰۔ احمد رام پوری از آثر بحوالہ مذکورہ
۱۱۔ حالات مشائخ، صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵
۱۲۔ افضل نامہ، جلد دوم

ظہیر علی صدیقی

غالبؔ اور رام پور

نوّاب محمد سعید خاں والی ریاست رامپور کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند نوّاب محمد یوسف علی خاں کو تخت نشین کیا گیا۔ مولانا فضل الحق خیر آبادی اس زمانہ میں رام پور میں تھے۔ وہ نواب صاحب کو اکثر غالب کے اشعار سناتے۔ چناں چہ نواب صاحب غالب سے کلام پر اصلاح لینے کے مشتاق ہو گئے۔ اور ۵ر فروری ۱۸۵۷ء کو اپنا کلام بغرض اصلاح غالب کی خدمت میں بھیج دیا۔ لیکن غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

''۱۸۵۵ء میں نوّاب یوسف علی خاں بہادر والی ریاست رامپور میرے شاگرد ہوئے؛ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔''

غالب نے اپنے جن خطوط میں نوّاب صاحب کے شاگرد ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں شاگرد ہونے کے سلسلے میں تاریخوں میں اختلاف ہے۔ ان اختلافی تاریخوں کے بارے میں مولانا عرشی نے استدلالی بحث کی ہے اور مکاتیبِ غالب میں تحریر کیا ہے:

''نوّاب صاحب ۵ر فروری ۵۷ء کو مرزا صاحب کے شاگرد

ہوئے۔ ۱۵ رفروری کو مرزا نے انہیں تخلص کے لئے چند الفاظ
لکھے۔ اور یکم مارچ ۵۷ء کو سرکار نے ناظم تخلص پسند فرمانے کی
مرزا صاحب کو اطلاع دی۔"

نوّاب صاحب اپنا کلام اصلاح کے لئے بذریعہ ڈاک غالبؔ کو ارسال کرتے۔ اور اکثر غالبؔ اصلاح کے بعد نواب صاحب کے کلام کی نقول بھیج دیا کرتے۔ ڈاک میں گم ہو جانے کے خطرے کی وجہ سے اصل کلام اپنے پاس رہنے دیتے۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی وجہ سے اگست ۱۸۵۷ء سے جنوری ۱۸۵۸ء تک منقطع رہا۔ نواب رامپور نے غالب کو رامپور آنے کی دعوت کے سلسلے میں پانچ مرتبہ دعوتی خطوط ارسال کئے لیکن وہ اپنی پینشن کے جھگڑوں کی وجہ سے رامپور نہیں آسکے۔

غالب کا رامپور سے سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔ لیکن اس وظیفے سے قبل بھی ریاست مالی طور پر ان کی مدد کرتی رہتی۔ چناں چہ غالب تفتہ کو لکھتے ہیں:

"نوّاب یوسف علی خاں تیئس بتیس برس سے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ یہ جس کو دسواں مہینہ ہے۔ سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپیہ مہینہ پاؤں اور دلّی رہوں تو سو روپیہ۔ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے۔"

یہ والی ریاست کی قدر دانی تھی کہ غالب ہی نہیں بلکہ اس دور میں اور اس کے بعد بھی شعرا اور

ادیبوں کو نوکر نہیں سمجھا گیا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ غالب کے مزاج پر نواب رامپور کا وہ خوف طاری نہیں تھا جو شخصی دورِ حکومت میں ایک حکمراں کا ملازم پر ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ غالب نواب صاحب کے کلام پر اصلاح اکثر دیر سے کر کے بھیجا کرتے تھے۔ چناں چہ سیاح کو لکھتے ہیں:

''بھائی تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے قصائد یونہی پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔''

مرزا ۲۷ رجنوری ۱۸۶۰ء کو رامپور پہنچے۔ ۴ روز والیٔ ریاست کی کوٹھی میں قیام کیا۔ مکان جداگانہ مانگا۔ انہیں دو تین حویلیاں عطا ہوئیں۔ غالب جس حویلی میں رامپور میں رہتے تھے۔ وہ محلہ راجدوارہ میں سنٹرل بینک کے سامنے سڑک کے کنارے واقع تھی۔ باہر کی جانب چند دوکانیں بنی تھیں۔ موٹا لکری کا چوبی دروازہ صدر دروازہ پر لگا تھا۔ ۲۱ رفروری ۱۹۴۴ء کو یہ مکان چھوٹی اینٹ کا بنا ہوا تھا۔ اور کھپریل پوش تھا۔ چیف منسٹر رامپور کے حکم سے اس پر قیام گاہِ غالب، پتھر لگایا گیا۔ ۲۲ رفروری کو نواب رضا علی خاں صاحب رامپور نے اس کی نقاب کشائی کی۔

مرزا پہلی مرتبہ رامپور میں ایک ماہ بیس دن رہے۔ اور دوبارہ ۱۲ راکتوبر ۶۵ء کو رامپور آئے۔ اس آمد کا مقصد نواب یوسف علی خاں کی تعزیت اور کلب علی خاں کی تخت نشینی کی مبارکباد دینا تھی۔ غالب جب پہلی مرتبہ رامپور آ کر یہاں سے واپس گئے ہیں تو یہ حویلی صاحب عالم میرزا رحیم الدین خاں کو بھی رہنے کے لئے دے دی گئی تھی۔

۶ رجولائی ۱۸۶۰ء کو غالب نے ایک خط علی بخش خاں کو لکھا ہے۔ اور اس خط میں میر مہدی مجروح اور میر سرفراز حسین کی ملازمت کے لئے سفارش کی ہے۔ اسی خط میں لکھتے ہیں:

''میری سکونت کی حویلی میں تو صاحب عالم میرزا رحیم الدین

بہادر آرہے ہیں۔ اب جو میں آؤں گا تو کہاں اتروں گا۔ خیر تم جانو کہیں نہ کہیں جگہ دیدو گے۔"

مرزا غالب کو ریاست رامپور سے جولائی ۱۸۵۹ سے ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء تک وظیفہ ملتا رہا اس عرصے میں انہیں دیگر نقد عطیات بھی ملے۔ مجموعی طور پر انہیں ریاست رامپور سے ۱۶ر ہزار ۷ سو ۲۵ روپیہ نقد ملا۔

اس کے علاوہ قاطع برہان کی اشاعت کے سلسلے میں بھی ریاست رامپور نے مدد کی چناں چہ سیاحؔ کے نام مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں تحریر کیا ہے:

"میرے پاس روپیہ کہاں کہ قاطع برہان کو دوبارہ چھپواؤں۔ پہلے نواب مغفور نے دوسو روپیہ بھیج دیئے تھے۔"

ان مالی امدادوں کے علاوہ ان کی اصلاحوں کو محفوظ کرنے میں بھی ریاست کا بہت بڑا دخل ہے۔ اگر یہ اصلاحیں رامپور میں محفوظ نہ ہوتیں تو ممکن ہے کہ غدر کے ہنگامے کی نذر ہو جاتیں۔ غالب کو بھی رامپور سے عشق تھا۔ انہوں نے کوسی دریا کی تعریف کے علاوہ اہلِ شہر کی شعر فہمی کی تعریف کی ہے۔

"رامپور کہاں۔ اس باب میں شیراز و اصفہان ہے ہر شخص شعر کا فریفتہ۔"

یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ غالب کے کلام کی تدوین کا کام بھی رامپور سے ہوا۔ 'نسخۂ عرشی' کو سید سلیمان ندوی اور ابوالکلام آزاد جیسے اکابرِ وقت نے سراہا ہے۔ غالب کے کلام میں کتابت کی اغلاط کی وجہ سے اکثر غلط الفاظ دخیل تھے۔ اور بہت سے ایسے اشعار ہمارے نصابوں میں داخل ہیں۔ ان غلط الفاظ کی وجہ سے ظاہر بات ہے کہ اشعار کے معنی بغیر تاویلات کے نہیں نکالے جاسکتے۔

۴۲ء میں انتخابِ غالب شایع ہوئی۔ اور سنہ ۱۹۵۸ء میں تقریباً ۱۶ر برس کی

کدوکاوش اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ملک کے سامنے پیش ہوا۔ ساہتیہ اکاڈمی نے ۱۹۶۱ء میں اس سال کی بہترین کتاب کی حیثیت سے ایوارڈ کا اعلان کیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے:

> ''غالب کی محفل میں مولانا عرشی کی حیثیت لاریب مرکزی ہے۔''

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد شرفا و امرا دہلی پریشان تھے۔ غالبؔ کی پینشن بند تھی، اگر نواب یوسف علی خاں غالب کی مدد نہ کرتے تو انہیں مزید پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

شہزاد انجم

رام پور میں غالب کی پہلی قیام گاہ

اردو کے معروف انشاپرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غزل کو اُردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب اُردو غزل کی آبرو ہیں۔ اُردو غزل اپنے اِس عاشق وشیدائی پر جس قدر ناز کرے بجا ہے۔ غالب کے قصائد کو بھی کافی شہرت ملی مگر اُن کی مخصوص اور منفرد نثر ابھی مزید توجہ کی طالب ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، غلام رسول مہر، ڈاکٹر خلیق انجم اور چند دوسرے محققین نے اُن کے مکاتیب کی تحقیق وتدوین کا حق ضرور ادا کیا ہے لیکن ہنوز ان کی تخلیقی نثر جہاں سے اُردو فکشن کی داغ بیل پڑتی ہے، جس نثر کو پڑھنے کے بعد اُس عہد کا پورا سیاسی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی منظر نامہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور زبان و بیان کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں وہ ابھی بھی ہمارے التفات کا متقاضی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب کی شخصیت، شاعری، زندگی، عہد، اُن کے معاصرین، اُن کی نثر نگاری پر جس قدر لکھا گیا ہے اتنا شاید ہی کسی دوسرے فنکار کے بارے میں لکھا گیا ہو، لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ غالب کے کلام اور مکاتیب کی اہمیت و معنویت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اُس سے نئی کرنیں پھوٹتی دکھائی دے رہی ہیں اور شاید اسی لیے کوشش کی جا رہی ہے کہ غالب کی زندگی کا کوئی بھی گوشہ اہلِ ادب کی نظر سے مخفی نہ رہے، اِسی حوالے سے غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی جانب سے میرے مقالے کا موضوع ''رام پور میں غالب کی قیام گاہ'' طے کیا گیا۔

غالب بلند پایا شاعر تھے، مگر وہ بھی انسان تھے۔ اس لیے ایک عام انسان اپنی زندگی میں جن کوتاہیوں، خود غرضیوں، مطلب پرستیوں سے وابستہ ہوتا ہے، غالب بھی اُن سے مُبرّا نہیں تھے۔ اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے فنکاروں کو صرف ہیرو بنا کر پیش نہ کریں بلکہ اُن کی زندگی کی خوبیوں اور کمزوریوں کی مکمل تصویر پیش کریں چنانچہ اس ضمن میں، میں ایک ذمہ دار اہلِ قلم شبیر علی خاں شکیب کی رائے سے اپنے مقالے کے بال و پر کو سنوارنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شکیب صاحب اپنی کتاب ''رام پور کا دبستانِ شاعری'' میں فرماتے ہیں:

''نواب یوسف علی خاں ناظم، قیام دہلی کے دوران مومن خاں مومن (متوفی ۱۸۵۰ء) کے شاگرد رہ چکے تھے، فروری ۱۸۵۷ء میں انہوں نے غالب سے تلمذ اختیار کیا۔ جو کہ صد گونہ باعثِ افتخار امر تھا، لیکن اس میں سیاسی مصلحت کا بھی گہرا دخل تھا۔ اس بارے میں ناظم کے ترجمے میں واضح ذکر آ چکا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوابِ موصوف بر بنائے معاہدہ انگریزوں کا ساتھ دینے پر مجبور تھے اور باغی فوج اور قلعہ معلی کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے انہیں ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو وہاں کے حالات سے مطلع کرتا رہے۔ چنانچہ مولوی فضل حق خیر آباد کے مشورے سے عظیم شاعر غالب کا انتخاب کیا گیا اور وہ

اِس خدمت کو برابر انجام دیتے رہے۔
غالب کے ایسے تمام خطوط جو قلعۂ معلّٰی کے حالات کے
بارے میں ہوتے تھے نواب یوسف علی خاں بموجب ہدایتِ
غالب تلف کرادیتے تھے۔ اگر وہ موجود ہوتے تو تحقیقی نقطۂ نظر
سے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے۔"
(رام پور کا دبستانِ شاعری، مولفہ شبیر علی خاں شکیب،
ص ۳۴۸۔۳۴۷)
غالب شناسی کے حوالے سے یہ ایک نیا رُخ ہے جس سے نئے مباحث کا آغاز ہو سکتا ہے۔
اور اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔
آخری دور کے نوّابین رام پور کی زندگی کا ایک رُخ یہ بھی تھا کہ یہ ادب پرور
تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کی جس طرح انہوں نے سرپرستی کی اس کی مثال بہت کم ملتی
ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُس عہد کے متعدد شعرا وادبا اُن کے دربار سے فیض یاب ہوئے۔
اس سلسلے کا آغاز نواب محمد سعید خاں صاحب جنّت آرام گاہ کے دور سے ہوتا ہے۔ اسی
حوالے سے نامور محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی رقمطراز ہیں:
"انتظامی امور سے فارغ ہو کر نواب جنّت آرام گاہ نے
سرپرستی علم و ادب کی طرف قدم اٹھایا۔ مولانا فضل حق
خیر آبادی، ملک الشعراء، مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی، حکیم احمد
خاں، فاخر رام پوری اور دیگر علما و ادبا مختلف کتابوں کے ترجمہ و
تالیف پر مامور ہوئے لیکن یہ پودا پروان چڑھنے نہ پایا تھا کہ
۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں نواب جنّت آرام گاہ نے وفات پائی"
(مکاتیب غالب، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، بارِ ششم ۱۹۴۹ء دیباچہ ز)

نواب یوسف علی خاں ناظم اپنے قیامِ دہلی کے دوران مومن کے شاگرد ہوئے بعد میں انہوں نے غالب کی شاگردی اختیار کی اور انہیں غالب کی شاگردی پر ناز تھا۔ ایک جگہ خود فرماتے ہیں:

ناظم ہمیں تتبع غالب پہ ناز ہے

شعر و شاعری سے نواب موصوف کو گہرا شغف تھا۔ انہوں نے شعرا و ادبا اور فنکاروں کی سرپرستی کی۔ ان کے عہد میں شعر و شاعری کے خوب چرچے رہے اور دہلی اور لکھنؤ کے متعدد شعرا کی انہوں نے مالی اعانت بھی کی۔ اس سلسلے میں کرنل بشیر حسین زیدی سابق چیف منسٹر ریاست رام پور کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"نواب فردوس مکاں کے جُود وسخا میں پناہ لینے والے حضرات کی طویل فہرست میں مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی، میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی، منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی، منشی امیر احمد صاحب، امیر مینائی، صاحبِ عالم میرزا رحیم الدین بہادر، حیا دہلوی، شیخ علی خاں بیمار، میر عوض علی، عدیل ملیح آبادی خوش نویس نستعلیق اور منشی انبا پرشاد لکھنوی داستان گو وہ ممتاز ہستیاں ہیں جن سے ارباب علم و ادب بخوبی واقف ہیں۔

لیکن ان تمام صاحبانِ فضل و کمال میں نجم الدولہ، دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغاز ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی وساطت سے نواب فردوس مکاں نے انہیں فنِ سخن میں اپنا مشیرِ خاص مقرر فرمایا تھا۔"

(بحوالہ مکاتیب غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، دیباچہ، ص ز)

میرزا اسد اللہ خاں غالب دو مرتبہ رام پور تشریف لائے۔ پہلی بار وہ ۲۷ جنوری ۱۸۶۰ء کو رام پور آئے اور ان کا قیام ۱۷ر مارچ ۱۸۶۰ء تک یہاں رہا۔ دوسری بار میرزا غالب ۱۲ر اکتوبر ۱۸۶۵ء کو رام پور تشریف لائے اور ۲۸ر دسمبر ۱۸۶۵ء تک مقیم رہے۔

فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں ناظم نے غالب کو رام پور تشریف لانے کا پہلا دعوت نامہ اوائل ۱۸۵۸ء میں ارسال کیا، دوسرا خط ۲۵ر نومبر ۱۸۵۸ء تیسرا ۲۱ر فروری ۱۸۵۹ء، چوتھا ۳ر اپریل ۱۸۵۹ء، پانچواں ۲۰ر مئی ۱۸۵۹ء اور چھٹا ۱۶ر دسمبر ۱۸۵۹ء کو ارسال کیا۔ یہ سارے خطوط مطبوعہ ہیں جو کہ مکاتیب غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی میں شامل ہیں۔ نواب صاحب کے مستقل اصرار کے بعد غالب رام پور کے سفر کے لیے آمادہ ہو گئے اور پہلی بار ۲۷ر جنوری ۱۸۶۰ء کو رام پور تشریف لائے۔

رام پور پہنچنے پر میرزا غالب نواب یوسف علی خاں ناظم کے مہمان رہے۔ چار دن مہمان رہنے کے بعد وہ کسی دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس سلسلے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی تحقیق سے ہمیں کافی روشنی ملتی ہے۔

> ''رام پور پہنچ کر میرزا صاحب نے سرکار کی خاص کوٹھی میں قیام کیا۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں میرزا صاحب کے ساتھ تھے۔ یہاں چار دِن گزارنے کے بعد از روی احتیاط جُداگانہ مکان کی خواہش کی، سرکار نے ایک مکان جو تین چار حویلیوں پر مشتمل تھا، قیام کے لیے عطا فرمایا۔''
>
> (دیباچہ مکاتیب غالب، ص ۹۷)

مولانا عرشی اپنی مزید تحقیق کی روشنی میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''بزرگانِ شہر سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ محلّہ راجدوارہ کی اس شاہراہ پر جو خاص باغ کو جاتی ہے مفتی احمد یار خاں صاحب

کے مکان کے محاذ میں ڈاک خانہ تھا اور میرزا صاحب نے اُس
کے مُتصل مکان میں قیام کیا تھا۔ چونکہ یہ مکان اُردو ادب کے
نیّرِ رخشاں کی فرودگاہ رہ چکا تھا۔ عالی مرتبت صاحب چیف منسٹر
بہادر کے حسب الحکم ۲۱ رفروری ۱۹۴۴ء کو اس پر یادگاری پتھر لگایا
گیا اور ۲۲ رفروری کو بندگان ہمایوں اعلیٰ حضرت شہریار رام پور
دام اقبالہم ملکہم نے ایک نمائندہ ادبی مجمع کے روبرو اُس کی
نِقاب کشائی فرمائی۔''

(دیباچہ مکاتیب غالب، ص ۹۷)

اس سلسلے میں رضا اکاڈمی رام پور کی جانب سے تقسیم کردہ 'دعوت نامہ یوم غالب'
کے مضمون کو پیش کرنا میں تاریخی و تحقیقی نوعیت سے ضروری سمجھتا ہوں:

رضا اکاڈمی رام پور

۱۲۔فروری سنہ ۱۹۴۴ء

جناب مکرم، تسلیم،

ہندوستان کے مایہ ناز شاعر و ادیب، مرزا غالب مرحوم کو رام پور سے جو تعلق
رہا ہے، اُس سے جناب بخوبی واقف ہیں۔ اسی تعلق کی بنا پر انھوں نے پیرانہ سالی کی
مجبوریوں کو نظر انداز کر کے، دوبار رام پور کا سفر اختیار کیا تھا۔
شہر میں ان کی پہلی قیام گاہ (واقع محلّہ راجدوارہ مقابل مکان جناب عزیز الرحمٰن
خاں صاحب، مالک رحمانی الیکٹرک اسٹور) کا بیرونی حصّہ ابھی تک محفوظ ہے۔ حسب
ہدایت عالی مرتبت جناب سید بشیر حسین صاحب، بہادر، زیدی، چیف منسٹر مذکورہ قیام گاہ پر
اُس کی تاریخی اہمیت کو محفوظ کرنے کے لیے یادگاری کتبہ لگایا جا رہا ہے۔ از راہِ علم نوازی و
ادب پروری، بندگان ہمایوں اعلا حضرت دام اقبالہم و مُلکہم، ۲۲ رفروری سنہ ۱۸۴۴ء کو

۱۲ر بجے دوپہر اس یادگار کی نقاب کشائی فرمائیں گے۔ جناب سے استدعا ہے کہ تاریخ بالا پر، وقتِ مقرّرہ سے ۱۵ر منٹ قبل جناب عزیز الرحمٰن خاں صاحب کے مکان پر تشریف لاکر اس تاریخی تقریب میں شرکت فرمائیں۔

لباس میں حسبِ مجاز ٹوپی یا عمامہ استعمال کیا جائے گا۔

نیاز مند

امتیاز علی عرشی

معتمد رضا اکاڈمی

میرزا غالب کی پہلی قیام گاہِ رام پور کی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے میں مرزا غالب کے تین خطوط کو بطور سند پیش کرتا ہوں۔ اپنے قیام کے سلسلے میں وہ تفتہ کو لکھتے ہیں:

''پہلے تو یہ بتاؤ کہ رام پور میں مجھے کون نہیں جانتا۔ کہاں مولوی وجیہ الزماں صاحب، کہاں میں؟ ان کا مسکن میرے مسکن سے دُور، پھر درِ دولت رئیس کہاں اور میں کہاں؟ چار دن والی شہر نے کوٹھی میں اوتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اوس میں رہتا ہوں۔ بحسب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے، ڈاک منشی آشنا ہوگیا ہے۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رام پور کا نام اور میرا نام۔ محلہ کی اور عرف کی حاجت نہیں بلکہ درِ دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے۔''

(بحوالہ مکاتیب غالب، مرتبہ مولانا عرشی، ص ۹۸)

دوسرا خط مرزا غالب نے حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے:

''مکان کا پتہ ضروری نہیں ہے۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس۔

ڈاک منشی میرا آشنا...ایک مکان کہ وہ تین چار مکانوں پہ مشتمل ہے، رہنے کو ملا ہے"۔

(بحوالہ مکاتیب غالب، مرتبہ مولانا عرشی، ص ۹۸)

"تمہارا خط پہنچا۔ تردد عَبَث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے۔"

(بحوالہ مکاتیب غالب، مرتبہ مولانا عرشی، ص ۹۸)

مرزا غالب کی پہلی قیام گاہِ رام پور کی موجودہ صورتِ حال کیا ہے؟ اس سلسلے میں تفصیلی معلومات کے لیے میں نے اپنے کئی بزرگوں اور احباب سے گفتگو کی، مگر کوئی واضح تصویر اُبھر کر سامنے نہیں آسکی اور میں رام پور میں غالب کی پہلی قیام گاہ کی تلاش میں اپنے دیرینہ کرم فرما اظہر عنایتی صاحب کے ساتھ محلہ راجدوارہ گیا۔ اتفاق سے سرِ راہ ہی اُسی محلّے کے اظہر عنایتی صاحب کے راجدوارے کے ہی ایک دوست شکیل احمد خاں صاحب سے ملاقات ہوگئی اور ان کے ساتھ ہم لوگ غالب کی پہلی قیام گاہِ رام پور، جواَب 'لکشمی نواس' میں تبدیل ہو چکی ہے، 'لکشمی نواس' کے مالک ہری اوم صاحب سے ہم لوگوں کی ملاقات نہیں ہوسکی۔ اُسی مکان میں لبِ سڑک کئی دُکانیں ہیں۔ اُنہیں میں سے ایک دُکان ہری اوم صاحب کے بیٹے کی "لکشمی گارمینٹس" کے نام سے ہے۔ اُن سے ہم لوگ ملے لیکن ہمیں کوئی جانکاری حاصل نہیں ہوسکی اور ہم لوگ معلومات حاصل کرنے سید بہاؤ الدین عرف بھولے میاں صاحب کے یہاں گئے۔ جن کا خاندان محلّہ راجدوارے میں ایک زمانے سے رہائش پذیر ہے۔ بھولے میاں صاحب کافی سِن رسیدہ اور کمزور ہو چکے ہیں لیکن اُن کا حافظہ ابھی تک قوی اور تر و تازہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے میری کافی رہنمائی کی۔ بھولے میاں صاحب کے بیان کے مطابق عزیز الرحمٰن خاں صاحب، عبدالرحمٰن خاں صاحب، جیلر کے بیٹے تھے۔ (مولانا عرشی نے 'دعوت نامہ یوم غالب' میں عزیز الرحمٰن خاں صاحب کا ذکر کیا ہے۔) حمایت مارکیٹ کی عمارت بھی عبدالرحمٰن خاص

صاحب کی جائداد تھی۔ عزیز الرحمٰن خاں صاحب کے چچا حافظ چھنو خاص صاحب لاولد تھے۔ حافظ چھنو خاں صاحب نے اپنی جائداد عزیز الرحمٰن خاص صاحب کو دے دی اس مکان کے علاوہ اُس مکان کے سامنے کا مکان جس میں میرزا غالب نے قیام کیا تھا، حافظ چھنو خاں صاحب کا تھا، اس لیے وہ مکان بھی عزیز الرحمٰن خاص صاحب کی جائداد میں آ گیا۔ اس مکان کے برابر گلی میں ایک چھوٹا سا ڈاکخانہ بھی تھا، جو عرصے تک باقی رہا، اُسی ڈاکخانے کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ موجودہ بڑا ڈاکخانہ تو ابھی چند برس قبل ہی بنا ہے جو یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے۔ اِس موجودہ ڈاکخانہ کا اُس زمانے میں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہاں ایک مکان تھا جس کا دروازہ محراب دار تھا۔ یہ جائداد ۱۹۴۷ء کے بعد ۵۰۔۱۹۴۹ء میں کسٹوڈین میں آ گئی اور یہ سارے مکان نیلام ہو گئے جنہیں لالہ لکشمی نرائن کے باپ لالہ گوپال داس نے خرید لیا تھا۔ اس زمانے میں کسٹوڈین کی جائداد شرنارتھی ہی خرید سکتے تھے اور یہ جائداد 'نکاسی جائداد' قرار دے دی گئی تھی۔ گوپال داس نے یہ جائداد خرید تو لی لیکن انہیں یہ خدشہ ہوا کہ کسی وقت بھی سرکار قیام گاہِ غالب کے نام پر اس مکان کو لے سکتی ہے اور غالب کی یادگاران کے لیے ایک مسئلہ بن سکتی ہے اور سرکار اس میں کوئی اکادمی یا یادگار قائم کر سکتی ہے۔ اِسی لیے انہوں نے اس مکان کو نئے سرے سے تعمیر کرایا اور ۲۲ رفروری ۱۹۴۴ء کو جو یادگاری کتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی کوششوں سے کرنل بشیر حسین زیدی سابق چیف منسٹر ریاست رام پور کی موجودگی میں نواب رضا علی خاں صاحب کے ہاتھوں لگایا گیا تھا، اُسے ہٹا دیا۔

حسنِ اتفاق سے یہ یادگاری کتبہ ۲۲ رمارچ ۱۹۹۸ء کو رام پور رضا لائبریری رام پور کے لیے لائبریری کے او ایس ڈی ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی صاحب نے خرید لیا اور اُسے میوزیم کلکشن میں محفوظ کر لیا ہے۔ اُس کتبے کو دیکھنے میں لائبریری گیا تھا جہاں پہ اُس کتبہ اور اُس کی تصویر کو مجھے لائبریری کے کارکن دنیش کمار ورماجی کی مدد سے بحکم او ایس ڈی دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ کتبہ سنگ مرمر پر کندہ ہے۔ جس کی لمبائی چھپن سینٹی میٹر، چوڑائی

تنالیس سینٹی میٹر اور موٹائی ساڑھے دس سینٹی میٹر ہے۔ پتھر کے درمیان میں سیاہ رنگ میں ''میرزا غالب کی قیام گاہ'' کندہ ہے۔ اُس کے نیچے ''۱۸۶۰ء میں'' لکھا ہے۔ پتھر کے دائیں جانب نیچے چھوٹے حروف میں ۲۲رفروری اور بائیں جانب نیچے ۱۹۴۴ء لکھا ہے۔ اس کتبے کی تصویر رام پور رضا لائبریری سے میں نے حاصل کی ہے جو آپ حضرات کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

اُس زمانے کے اخبار ''مدینہ'' بجنور مورخہ دوشنبہ ۲۸رفروری ۱۹۴۴ء کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں جو اُس زمانے کی علم پروری کا آئینہ دار ہے، ساتھ ہی ساتھ اِس اقتباس سے کئی سوالات بھی ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں ملاحظہ ہو:

''ہندوستان میں اکابرِ رِجال کی یادگاروں کی طرف سے جو بے توجہی برتی جارہی ہے اور غالب جیسے شاعر و ادیب کی قبر تک جس کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے، اس کے پیش نظر اعلیٰ حضرت نواب رام پور کی یہ فرض شناسی قابلِ تعریف ہے کہ انہوں نے رام پور میں غالب کی قیام گاہ کو ایک مستقل یادگار میں تبدیل کر دیا ہے۔ یورپ میں تو کارلائل جیسے افراد کے مکانات کو ملکیت عوام قرار دے کر قوم کی سبق آموزی و نصیحت اندوزی کے لیے قابلِ دید یادگاریں بنادی گئی ہیں مگر ہندوستان میں ابھی تک کوئی ایسی کوشش نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان میں رام پور کی یہ پہلی مثال ہے..........

اسی رضا اکاڈمی نے ۲۲رفروری کو یومِ غالب منایا۔ جس کی ادبی مجلس میں بہت سے ممتاز فضلا نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر بندگانِ عالی نے مرزا غالب کی قیام گاہ پر نصب شدہ سنگِ یادگار

کی نقاب کشائی فرمائی۔ (اس مکان میں اس تعلق کی بنا پر جو
مرزا کو نواب فردوس مکاں سے ملا تھا۔ مرزا غالب ۱۸۶۰ء میں
سرکاری مہمان کی حیثیت سے فروکش ہوئے تھے) اور معارف
پرور سرکار فیض تاب نے حکم دیا کہ قیام گاہ کو خرید کر اس میں
غالب سے متعلق تمام لٹریچر مہیا کیا جائے تا کہ ریسرچ ورک
کرنے والوں کے لیے تمام مواد یکجا ہو جائے نیز رضا اکاڈمی
اِسے اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنائے۔ اُمید ہے کہ اعلیٰ حضرت
کی توجہ سے یادگار ادارہ ہندوستان کا ایک نمونہ کا ادارہ بن
جائے گا اور دوسرے حلقے بھی اس سے متاثر ہو کر اس کی تقلید
کریں گے۔"

وہ کوششیں، وہ خواب، وہ علمی سرگرمیاں اور ادب پروری اب قصہ پارینہ ہو چکی ہیں۔ آج حقیقت یہ ہے کہ رام پور میں غالب کی پہلی قیام گاہ محلہ راجدوارہ میں "لکشمی نواس" میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اب اُس کے آس پاس بھی بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ یہاں اردو کے نامور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب نے کبھی قیام کیا تھا۔ اس مکان کے باہر کپڑے، ریڈیو، ٹی وی، مٹھائی کی دُکانیں ہیں۔ ہندی کے مشہور روزنامہ دینک جاگرن، مرادآباد (بریلی) کے ۲۶ اپریل ۲۰۰۳ میں شائع شدہ غالب کی قیام گاہِ رام کی موجودہ تصویر شائع ہوئی جو میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

(اس مقالے کی تکمیل میں مجھے جن بزرگوں اور احباب خصوصاً بھولے میاں صاحب، ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی صاحب، اظہر عنایتی صاحب، عتیق جیلانی صاحب، دنیش کمار ورما صاحب نے معاونت کی ہے میں اُن سبھی حضرات کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔)

علیم اشرف خان

مرزا اسداللہ خان غالبؔ اور رام پور

انیسویں صدی ہندوستانی تاریخ میں نہایت پُر آشوب عہد ہے اور غالبؔ بھی اسی صدی کے نابغۂ روزگار ہیں جنہوں نے اپنے عہد کی نہ صرف یہ کہ بھرپور عکاسی کی ہے اور اپنے عہد کے حالات کو بہ نحو احسن اپنی عمر میں گزارا ہے۔ نیز انہوں نے اس دور پُر ابتلا کے منفی اور حتمی نقوش کو معاشرے میں منعکس کرانے کی عملی سعی بھی کی ہے۔

غالب کی زندگی میں انقلاب اٹھارہ سو ستاون ایک نہایت عبرت آمیز کہانی لے کر آیا اور اس کی بازگشت ان کی ساری بقیہ زندگی میں سنائی دیتی رہی۔ غالب کا رامپور آنا بھی اسی بازگشت کی ایک مضبوط کڑی ہے کیونکہ غالب دو مرتبہ رامپور آئے پہلی مرتبہ ۱۸۶۰ عیسوی اور دوسری دفعہ ۱۸۶۵ء میں کلب علی خان کے زمانے میں۔

غالب کے شاگردوں کی بڑی تعداد ہے اس میں کچھ شاگرد رامپور کے بھی ہیں اور انہی رامپور کے شاگردوں میں سب سے بڑا نام خود نواب محمد یوسف علی خان بہادر فردوس مکان والی رامپور کا ہے جن کا تخلص ناظم ہے۔ ناظم ۵/ مارچ ۱۸۱۶ء (مطابق ۵/ ربیع

الثانی ۱۲۴۱ ہجری) کو پیر کے دن پیدا ہوئے۔ ناظم کے احوال میں یہ ملتا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں دہلی آئے اور مرزا غالب سے فارسی پڑھی مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل الحق خیر آبادی سے عربی اور دیگر علوم عقلیہ و منطق پڑھی۔ ناظم نے غالب کے علاوہ خلیفہ غیاث الدین سے بھی فارسی پڑھی تھی۔

ناظم ۱۸۵۵ء میں والد کے جانشین ہوئے اور دو سال بعد ۱۸۵۷ء کا غدر برپا ہوا جس میں ریاست نے کسی شورش میں شریک نہ ہوکر انگریزوں کے لئے قابلِ قدر خدمات انجام دی تھی اسی کے صلے میں گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے ۱۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو فتح گڑھ کے دربار میں ناظم کو ۲۰ ہزار روپے کا خلعت عطا کیا اور سلامی گیارہ کی جگہ تیرہ ضرب توپ مقرر ہوئی، یہی نہیں ''فرزند دلپذیر'' کا خطاب بھی سرکار انگلیشیہ سے ملا۔ بعد میں ۱۴۶ گاؤں کا ایک علاقۂ جدید ضلع بریلی میں بطور جاگیر بھی ملا اور اس عطیے کے موقع پر نواب صاحب نے یہ قطعہ موزون فرمایا:

جب گورمنٹ سے ہوا حاصل ٭ ملک مجھ کو بہ صیغۂ انعام
ناظم از روئے ہمت عالی سال بخشش ہے بخششِ حکام

۱۲۷۶ ہجری

غالبؔ نے بھی اس عطیے کی تہنیت میں ایک قطعہ لکھا تھا جو ان کے کلیات میں شامل ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں جولائی ۱۸۶۱ء میں ایک حکم کے مطابق یکم نومبر ۱۸۶۱ء کو الٰہ آباد میں ایک عظیم الشان دربار مقرر ہوا جس میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور وائسرائے نے بعض دوسرے والیانِ ریاست کے ساتھ نواب یوسف علی خان بہادر کو بھی نائٹ کا خطاب اور تمغہ دیا۔ ۱۸۶۴ء میں گورنر جنرل لارنس نے نواب صاحب کو اپنی مجلس وضع قوانین کا رکن مقرر کیا اور اس سلسلے میں نواب صاحب کو کلکتہ جانا پڑا جہاں کی آب و ہوا راس نہ آنے کے سبب وہ بیمار ہو گئے اور رامپور واپس آ گئے۔ انہیں سرطان کا مہلک مرض لاحق ہوا

تھا۔ رامپور آنے پر قدرے افاقہ تو ہوا جس پر غالب نے دو قصیدے ایک اردو میں اور دوسرا فارسی میں کہا تھا مگر دوبارہ اس مرض کے حملے میں ۲۱/اپریل ۱۸۶۵ء/۲۴/ذی قعدہ ۱۲۸۱ ہجری کو جمعہ کے دن دوپہر کے وقت وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ناظم کے بارے میں یہ ملتا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء میں غالب کے شاگرد ہوئے اس سے پہلے بھی شعر نہیں کہتے تھے اور ایسا لگتا ہے کہ غالباً شعر گوئی غالب کی سرپرستی کا بہانہ بن گئی تھی۔

ناظم کا دیوان دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے پہلے ۱۲۷۸ ہجری میں اور دوسری دفعہ ۱۲۸۶ ہجری میں پہلے دیوان میں زیادہ تر غالب کا اصلاحی کلام ہے اور دوسرے میں اسیر کا دیکھا ہوا بھی موجود ہے جن سے وہ غالب کے بعد مشورہ کرتے رہے امیر مینائی نے انتخابِ یادگار میں لکھا ہے کہ نواب صاحب مجھ سے بھی اصلاح لیتے رہے جس پر مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب میں سوالیہ نشان لگایا ہے۔

ناظم کے دیوان میں غزلوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن پر غالب کے کلام کا دھوکہ ہوتا ہے جس سے غالباً یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غالب نے غزلیں کہہ کر اپنے شاگرد کو پیش کر دی تھیں کیونکہ ان کا اندازِ فکر، اسلوبِ بیان، مضمون آفرینی اور خاص الفاظ و تراکیب غالب جیسی ہیں ایک اور بات جو اسی امر کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ غالب سے نواب صاحب کی شاگردی کا سابقہ اور چار سال بعد ضخیم دیوان کا شایع ہونا ہے یعنی غالب نے ۱۸۵۷ء میں نواب صاحب کو اپنا شاگرد بنایا اور ۱۸۶۱ء میں ان کا ضخیم دیوان بھی شایع ہو گیا۔ اس لیے کسی نو آموز کے لئے یہ امر محال ہے کہ چار سال کی کم مدت میں ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑ دے۔

ناظم کے چند متفرق اشعار ہیں:

ہے یہ ساقی کی کرامت، کہ نہیں جام کے پاؤں ۔۔۔ اور پھر بزم میں سب نے اسے چلتے دیکھا

واعظ و شیخ سبھی خوب ہیں، کیا بتلاؤں! میں نے میخانے سے کس کس کو نکلتے دیکھا

کیوں آکے کہو درپہ، کہ وہ گھر میں نہیں ہیں کیا ہم نہیں پہچانتے، سرکار کی آواز

اب لکھیں گے شکوۂ بیداد ہم دل کھول کر نام ان کا آسماں ٹھیرا لیا تحریر میں

اگرچہ خوش ہوں، پر آتا ہے رحم بھی تم پر کہ مجھ سے غمزدہ کو غمگسار سمجھے ہو

ہو رات تو جیتے رہیں اُمید سحر پر

یہ روزِ سیہ ہے، شب دیجور نہیں

حکیم فتح یاب خان رامپوری متخلص بہ اخگر:

یہ قوم کے پٹھان تھے۔ اور شاعری ورثہ میں ملی تھی ان کے دادا محمد خان عَلَم (متوفی ۱۲۶۸ ہجری) تھے اور والد ظفریاب خان جو مظفر خان کے نام سے مشہور ہوئے ان کا زیادہ زمانہ نواب عبداللہ خان بہادر (نواب محمد سعید خان والی رامپور کے بھائی اور نواب ناظم فردوس مکان کے چچا) کی رفاقت میں بحیثیت ناظر دہلی اور میرٹھ میں بسر ہوا۔ اخگر ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے رسمی تعلیم مختلف اساتذہ سے ہندوستان کے طول عرض میں گھوم کر حاصل کی وہ بڑے سیلانی تھے طبابت میں بھی دسترس تھی۔ اخگر کا انتقال ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں چترہ (ھوگلی) میں ہوا اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔

صاحبزادہ عباس علی خان رامپوری متخلص بہ بیتاب:

رامپور کے حکمراں خانداں سے متعلق تھے ان کے والد نواب محمد عبدالعلی خان بہادر جو نواب فردوس مکان محمد یوسف علی خان بہادر کے حقیقی چچا تھے وہ تقریباً ۱۲۲۴ ہجری (۱۸۰۹ء) کے آس پاس پیدا ہوئے۔ ۱۸۳۷ء تک دہلی میں رہے پھر لکھنؤ چلے گئے اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے باعث ہم عصروں میں ممتاز تھے اردو کلام پر حکیم مومن خان مومن دہلوی سے اصلاح لیتے تھے اور ان کی وفات ۱۸۵۲ء کے بعد کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ وہ غالب کے دوسرے سفر رامپور ۱۸۶۵ء کے بعد ان کے شاگرد ہو گئے اور اپنا

دیوان بھی اصلاح کے لئے غالب کی خدمت میں روانہ کیا اور ان کی وفات تک خط و کتابت کے ذریعے مشورہ بھی کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور میں حاکم صدر بنائے گئے اور فروری ۱۸۸۳ء تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔ ۶؍جون ۱۸۸۳ء؍ ۲۹؍رجب المرجب ۱۳۰۰ ہجری کو ظہر کے وقت انتقال کیا۔ انہوں نے دو قصّے 'گلزارِ عشق' اور ''بہارِ عشق'' کے نام سے تحریر کیے تھے جو شایع نہ ہوئے مگر ان کے قلمی نسخے رامپور رضا لائبریری میں موجود ہیں۔ ان کا دیوان ''گلدستۂ باغِ جنان'' کے عنوان سے شعبان ۱۳۰۱ ہجری میں چھپ گیا تھا۔

بیتاب کے کلام کا نمونہ ہے:

ہر بات میں برہم کوئی اتنا نہیں ہوتا
آپس میں ذرا سمجھو تو، کیا کیا نہیں ہوتا
یوں کوئی ستاتا ہے مری جان کسی کو
خوبی یہ جسے اپنی بھروسا نہیں ہوتا
کچھ بن گئی ہے ایسی ہی دم پر مرے ورنہ
مرنا تو کسی کو بھی گوارا نہیں ہوتا

--

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ
ساقی اگر نہیں، نہ ہو، مے سے کام ہے
بیتاب! پی خدا نے دئے ہیں تجھے بھی ہاتھ
یہ خُم ہے، یہ سُبو ہے یہ شیشہ یہ جام ہے

مولوی عبدالسمیع رامپوری متخلص بہ بیدل:

ان کی فارسی اور عربی کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ ۱۲۷۰ ہجری؍۱۸۵۴ء میں

کسبِ علم کے لیے دہلی آئے اور مفتی صدر الدین خان سے عربی پڑھی انہی دنوں میں شعر گوئی کا شوق ہوا تو میرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہونے اوایل میں طبیعت غزل کی طرف مائل رہی بعد میں اس رسمی شاعری کو چھوڑ کر اپنی تمام توجہ مذہبی علوم و مسایل پر محدود کردی ایک نعتیہ دیوان او رایک مختصر رسالہ نورِ ایمان کے نام سے موجود ہے جو شایع ہو چکا ہے اس میں مختلف دینی مسائل نظم میں بیان ہوئے ہیں۔

نادر شاہ خان رامپوری متخلص بہ شوخی:

شوخی کے والد محمد ضامن خان رامپور کے پٹھان تھے مگر شوخی دہلی میں متولد ہوئے مولانا آزاد نے شوخی اور غالب کی ملاقات اور شاگردی کا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب غالب ۱۸۶۰ء میں نواب محمد یوسف علی خان بہادر کی دعوت پر رامپور تشریف لے گئے تو شوخی وہاں موجود تھے یہ غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح کی درخواست کی مگر میرزا کا اصول یہ تھا کہ چونکہ میں دربار رامپور کا وظیفہ خوار ہوں اس لیے رامپور میں والیٔ ریاست کی اجازت کے بغیر کسی کو بھی شاگردی میں قبول کرنا مناسب نہیں ہے۔ شوخی اس جواب سے بہت مایوس ہوئے لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ چند دن بعد جب حاضر ہوئے تو مرزا کی شراب کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا وہ صرف مراد آباد میں ہی مل سکتی تھی۔ شوخی وہاں سے گھر آئے اور والد سے روپیہ لے کر مرزا کے لئے ۵ بوتلیں شراب کی خرید لائے جب غالب نے قیمت ادا کرنا چاہی تو لینے سے انکار کر دیا اگلے دن جب شوخی مرزا کے پاس آئے تو مرزا نے ان کی غزل مانگی جس پر اصلاح طلب تھی شوخی نے جیب سے کاغذ نکال کر دے دیا۔ مرزا نے نہ صرف یہ کہ اصلاح دی بلکہ جگہ جگہ پر اصلاح کی وجوہ بھی بیان کرتے رہے۔ شوخی وسطِ عمر میں طلبِ معاش میں بنارس گے اور وہاں کلکٹری کے دفتر میں پہلے نائب ناظر اور بعد میں پیشکار ہو گئے۔ میرزا قادر بخش صابر ان دنوں بنارس میں مقیم تھے شوخی ان سے مشورہ کرنے لگے اس کے بعد کلکتہ چلے گئے اور وہاں کچھ تجارت کا

سلسلہ کرلیا۔ مولانا آزاد سے شوخی کی ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں شوخی کا انتقال ہوگیا۔ ان کے کلام کا نمونہ ہے:

آج پھر پی کے شراب، آئے ہیں ان کی بزم میں
کل نکلوائے گئے تھے ہم اسی تقصیر پر

--

ہر ہر سخن پہ، جان نہ دینے کا ہے گلہ
اک بات آگئی ہے بتِ خود نما کے ہاتھ

صاحبزادہ عبدالوہاب خان بہادر رامپوری متخلص بہ سروش:

وہ رامپور کے حکمراں خاندان سے تھے ان کے والد صاحبزادہ عبدالرحمن خان بہادر اور دادا نواب غلام محمد خان بہادر غفران مآب تھے جو نواب یوسف علی خان بہادر فردوس مکان کے بھی دادا ہوتے تھے۔

سروش ۱۲۳۸ء میں پیدا ہوئے ابتدا میں مومن سے مشورہ کرتے رہے پھر غالب سے اصلاح لی اور ان کی وفات کے بعد خوشوقت علی خان خورشید سے بھی استفادہ کیا، ان کا نمونہ کلام:

سچ تو یہ ہے، لاکھ سر مارا کرو، ماتھا گھسو
کچھ کرو، لکھا نہیں مٹتا، کبھی تقدیر کا

--

تھامتا دل کو، کہ آنکھوں کو نہ رونے دیتا
ایک میں، جھگڑے ہزاروں، کہو کیا کیا کرتا

صاحبزادہ محمد فدا علی خان بہادر رامپوری متخلص بہ فدا:

فدا کے والد نواب محمد کاظم علی خان بہادر والی رامپور نواب محمد سعید خان کے

چھوٹے صاحبزادے تھے گویا فدا فردوس مکان محمد یوسف علی خان بہادر ناظم کے بھتیجے ہوئے یہ ۱۸۳۶ء/۱۲۵۲ء میں پیدا ہوئے شروع میں نواب مرزا خان داغؔ سے اصلاح لی پھر غالب سے بھی فیضیاب ہوئے ان کا ایک شعر ہے:

یاد آتی ہے جب کاوشِ مژگاں مرے دل کو
دیتا ہے تسلی ترا پیکاں مرے دل کو

سید افتخار الدین رامپوری متخلص بہ مغلوبؔ:

یہ سید کفایت اللہ کے بیٹے تھے ۱۸۶۵ء میں عین جوانی میں صرف ۲۸ برس کی عمر میں وفات پائی انہوں نے بھی غالب کے علاوہ میر احمد علی رسا (صاحبزادہ سید امام الدین رامپوری) سے بھی اصلاح لی تھی:

ایک مغلوبؔ کا جھگڑا تھا، سو وہ مر ہی گیا
جس سے جی چاہے ترا، اس سے تو اب مل قاتل

فخر الدین رامپوری متخلص بہ نادمؔ:

ان کا نام بھی تلامذہ غالب میں آتا ہے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اخبار الصنادید میں ان کی کہی مختلف تاریخیں ملتی ہیں۔ نواب حامد علی خان بہادر والی رامپور کے صاحبزادے حسن علی خان کی تاریخ ولادت اس طرح کہی ہے:

طلوع اختر اقبال گردید — بہ برج خسرو جمشید دوراں
فلک سند انجمن آرائے انجم — "بہ برج سویمیس ناہید رقصاں"
عطارد مشتری را مژدہ بخشید — "بہ برج مہر بین شد ماہ تاباں"

۱۳۱۸ ہجری برآمد ہوتا ہے۔

انہوں نے قلعہ رامپور کی تاریخِ تعمیر بھی کہی تھی:

قلعہ جو بنایا ہے سرکار نے — کہ ہر وقت جس میں برستا ہے نور

لکھی اس کی تاریخ ناد‌م نے یوں "بنا خوب قلعہ رامپور"

۱۳۲۰ ہجری برآمد ہوتا ہے۔

قلعہ میں امام باڑے کی تاریخ یوں رقم کی ہے:

سرِ ادب سے یہاں آؤ مومنو دیکھو

"بہ جائے عیش نہیں گھر بنا ہے ماتم کا"

۱۳۱۹ یا ۱۳۲۰ ہجری برآمد ہوتا ہے

بہر حال یہ بات مسلم ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے غالب کی معاشی زندگی کی دھجیاں اڑا دی تھیں اس لیے انہیں اپنی گزر بسر کے لیے کسی نہ کسی دربار یا دامنِ دولت سے وابستہ ہونا ضروری تھا اس لیے غالب نے رامپور آ کر اپنی اسی معاشی تنگدستی اور عسرت سے کنارہ کشی کی ایک کامیاب کوشش کی اور دہلی کے حالات سے بد دلی بھی ان کی اس آمد کا ایک اہم سبب بنا تھا۔ غالب نے رامپور میں اپنے شاگردوں کی اصلاح کا کام کیا اور اسی اصلاح کے سہارے غالب کا معاش بھی برقرار رہا۔

کمال احمد صدیقی

غالب کا ایک خط

بخطِ غالب ہے، مگر

بخطِ غیر مشہور ہے

حضرتِ عالی نعمت آیہ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج جو تہادن ہے کہ توقیع رفیع عز ورود لایا ہے مندرجہ
ملفوفہ کی رو سے تنخواہ مئی ۱۸۶۸ کا سو روپیہ معرض وصول میں آیا ہے جواب کے
جلد نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ زمین گرمی کی شدت کے سبب سے اور احتباس ہوا
کہ جو لازمہ موسم برسات ہے بیکار محض ہو گیا ہوں مطلق کچھ لکھ نہیں سکتا
اور کوئی ایسا شخص کہ جس سے کچھ لکھواؤں اس چار روز میں میرے پاس نہیں آیا
آج اس وقت ایک صاحب آئے اون سے میں نے یہ عریضہ لکھوا لیا — پیر و مرشد
سابق کے عریضے کے ساتھ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ہے اور اس کی رسید اس نوازش نامے
میں مرقوم نہ تھی مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لفافہ ڈاک میں تلف نہ ہو گیا ہو اگر اس کی رسید سے شرف اطلاع پاؤں
تو دلجمعی ہو جائے سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار ۱۵۔ جون ۱۸۶۸ء

ہم لوگوں کے قلم کی اتنی تحریریں باقی رہیں جتنی غالبؔ کی تحریریں۔ شاید صرف ایک صیغہ غائب میں ہے (مظہر العجائب کے لیے، جو انہوں نے اپنے جد قوقان بیگ خان کے، عہدِ شاہ عالم ہیں، وارِدِ ہندستان ہونے ملکۂ ولایت کو فارسی قصیدہ ۱۸۵۵ء بہ سبیلِ ڈاک بھجوانے اور تین خط انگریزیں میں بے واسطۂ انڈیا گورنمنٹ ولایت سے اس کے ڈاک میں آنے کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ یہ خط صیغۂ غائب ہیں ہے، لیکن آخر ہیں دستخط خطاب کے ساتھ ہیں: نجم الدولہ نظام الملک اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ

خط کا آخری جملہ ہے: مظہر العجائب

اب ہم اُن تینوں خطوں کے خلاصے لکھ کر اس کے ذکر کو ختم کرتے ہیں۔ لیکن یہ خلاصے اُن کے قلم سے لکھے ہوئے باقی نہیں رہے۔

یہاں اس خط کا تجزیہ مقصود نہیں ہے۔ اس پر لکھا جا چکا ہے کہ قوقان بیگ خان شاہ عالم کے عہد میں نہیں آئے تھے۔

موضوع ''غالب اور رام پور'' ہے۔ غالبؔ کی اس تحریر کا اقتباس عمداً دیا گیا ہے۔ غالب کے زیادہ تر خط کاروباری نوعیت کے ہیں۔ نواب یوسف علی خاں جو غالبؔ کے شاگرد ہوئے، اور انہیں غالبؔ نے صبح پنج شنبہ، ۲۷ شعبان ۱۲۷۳ ہجری کو لکھا، جسے تقویم سے خلیق انجم نے غالب کے خطوط (جلد سوم، ایڈیشن، ۱۹۸۷ء) میں روز یکشنبہ ۱۵ر فروری ۱۸۵۷ء لکھا ہے۔ یہ سہو ۱۹۸۷ء ہی کے ری پرنٹ میں درست کر دیا گیا ہے۔ ۱۵ر فروری ۱۸۵۷ء کے خط میں، پانچ تخلص تجویز کیے:

> ''میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسمِ سامی اور نامِ نامی تخلص رہے۔
> ناظمؔ، عالیؔ، انورؔ، شوکتؔ، نیساںؔ، ان میں سے جو پسند آئے، وہ
> رہنے دیجیے۔''

یوسف علی خاں نے ناظمؔ پسند کیا۔

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

آداب بجا لاتا ہوں۔ غزلوں کے مسودے کو صاف کر کے حضور میں بھیجتا ہوں مسودات اپنے پاس
رہنے دیں میں اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے تو میں پھر اُس کو صاف
کر کے بھیج دوں ورنہ موقع حک و اصلاح مجھ کو یاد رہتا ہے میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم اور
نام یعنی تخلص رہے۔ ناظم عالی اور شوکت نشان انہیں سے جو پسند آئے وہ رہنے
دیں مگر یہ نہیں ہم خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک
زمانہ ادب تم سلامت رہو قیامت تک عنایت کا طالب غالب روز یکشنبہ ۱۵ فروری ۱۸۵۹

یہ حسنِ اتفاق ہے کہ غالبؔ کی تاریخ رحلت ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء ہے گویا یوسف علی خاں، والیِ رام پور کے نام یہ خط غالب نے اپنی وفات سے ٹھیک دس برس پہلے لکھا تھا۔

نواب یوسف علی خاں کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے کلب علی خاں والیِ رام پور ہوے، اور وہ بھی غالبؔ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ غالبؔ اپنی وفات تک دربار رام پور سے وظیفہ پاتے رہے۔ وظیفہ کے علاوہ بھی یہ دونوں نواب غالبؔ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرتے تھے۔ کم از کم غالبؔ دربارِ رام پور گئے اور نواب کے مہمان رہے۔ جو تفصیل غالبؔ کے خطوں میں، والیانِ ریاست، اور دوسرے احباب اور شاگردوں کے نام ہیں، ایک اچھا خاکہ رام پور سے غالب کی وابستگی کا بنایا جاسکتا ہے۔ ایک اہم بات جو سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ سرسیّد نے جب آئینِ اکبری کی تدوین کی اور غالبؔ سے اُس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی، تو غالب نے اسے تقویم پارینہ قرار دیا اور جو کچھ لکھا اسے منفی ہی کہا جاسکتا ہے۔ دونوں کے تعلقات میں کھٹاس آگئی تھی۔ رام پور سے واپسی کے سفر میں غالبؔ مرادآباد میں ٹھہرے، اور مرادآباد میں سرسیّد تعینات تھے۔ سرسیّد کو معلوم ہوا، تو وہ گئے اور

مرزا کو اپنے گھر لے آئے، اور دونوں کے درمیان رنجش دور ہوگئی۔ سامان جہاں رکھا گیا، وہاں سے کچھ دیر کے بعد میرزا نے ایک بوتل جو وہ ساتھ لائے تھے، کم پائی۔ میرزا نے سید احمد خاں سے کہا کہ کچھ سامان کم ہے۔ سر سید نے کہا کہ وہ محفوظ ہے۔ میرزا نے کہا: مجھے چل کر دکھائیں تو مجھے یقین آئے۔ کوٹھری یا دوسرے کمرے میں لے جا کر سید احمد خاں نے بوتل دکھائی، تو میرزا نے اسے غور سے دیکھا، اور کہا: مقدار کچھ کم ہوگئی ہے۔ دونوں ہنس دیے۔۔۔اور ماضی کی تلخیاں ختم ہوگئی۔

اب تک جو کچھ میں نے عرض کیا، اس کا تعلّق میرے آج کے موضوع کے اطراف سے تھا۔ والیانِ رام پور کو غالبؔ نے جو خطوط لکھے، وہ دارالانشا میں محفوظ رہے، اور اپنے کلام کا جو نسخہ نوّاب کو پیش کیا، وہ بھی یہاں محفوظ رہا۔

ان دو والیانِ رام پور کے علاوہ غالب نے جو خط زین العابدین خاں (کلّن میاں) خلیفہ احمد علی رام پوری، منشی سیل چند اور مولوی محمد حسن کے نام جو خط غالبؔ نے لکھے، ان کی تدوین رضا لائبریری کے رکاب دار امتیاز علی خاں عرشی نے مکاتیبِ غالبؔ کے نام سے کی۔ اس کتاب میں ۱۱۷ خط ہیں۔ عرشی صاحب نے دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) بھی مرتب کیا۔ اس کا دیباچہ اور اختلافِ نسخ کا باب اہم تحقیقی کام ہیں۔

دارالانشا میں غالبؔ کے جو خطوط ہیں، اُن کے عکس پرتھوی چند نے مرقعِ غالب میں چھاپے۔ پہلی بار غالبؔ کے قلم کی تحریر عام ہوئی۔

۱۹۷۰ء میں جب میں نے بیاضِ غالب: تحقیقی جائزہ لکھی تو عرشی صاحب کی یہ دو تالیفیں اور پرتھوی چندر کی کتاب ایک طالبِ علم کی طرح پڑھی۔ پرتھوی چندر کے کام میں ایک آدھ سطر کی تکرار بھی نظر آئی۔ جو پہلی نظر ہی میں دکھائی دیتی ہے۔ اُس وقت ایک بات پر نظر نہیں گئی۔ ۱۹۸۷ء کے اواخر میں، ڈاکٹر خلیق انجم نے جب ''غالب کے خطوط'' کی تیسری جلد کی ایک کاپی مجھے تحفۃً دی، اور میں اس کا مطالعہ کر رہا تھا، ص ۱۳۰۵ پر نوّاب کلب

علی خاں کے نام جو خط ہے، اور جسے مکاتیبِ غالب میں عرشی صاحب نے بخطِ غیر بتایا ہے، اور متن میں ایسا ہی اس خط میں بھی لکھا ہے، اور خلیق انجم نے بھی عرشی صاحب کے حوالے سے ایسا ہی لکھا ہے۔۔۔ میری نظر نے میرے ذہن کو سگنل بھیجے کہ نہیں۔ یہ غالب کے اپنے ہاتھ کی تحریر ہے۔ اسمیں دل جمعی عین کے بغیر ہے۔ ذہن نے کہا کہ جان بوجھ کر یہ املا غلط لکھا گیا ہے۔

میں نے ایک مضمون لکھ کر ہماری زبان میں اشاعت کے لیے دیا، جو ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۷ء کے شمارہ (۴۷، جلد ۴۶) میں آخری صفحے، یعنی ص ۸ پر، اور اس کا آخر کا حصّہ ص ۷ پر چھپا۔ ابرار رحمانی (اب ڈاکٹر ابرار رحمانی) نے مجھ حقیر کے دلائل سے اختلاف کیا۔ اسکا جواب لکھا گیا۔ عابد پیشاوری نے ایک خط ہماری زبان کو لکھا اور مجھ فقیر کے دلائل کو ناقابلِ اعتنا قرار دیا۔ مجھ حقیر نے ایک تفصیلی مضمون لکھا، جو کتاب نما میں شائع ہوا۔ تب سے اب تک رہائش چار بار بدلنا پڑی۔ وہ سارے مضامین فراہم نہیں، اور میں حقیر یہ قضیہ بھول بھی گیا تھا کہ، ایوانِ غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایک سمینار میں خلیق انجم نے اپنے خطبہ صدارت میں ایک جملہ کہہ کر یہ قضیہ پھر زندہ کر دیا۔ انہوں نے کہا:

> ''غالب کے بہت سے جعلی خط بتائے گئے، جو چھپے۔ غالب کا پہلا جعلی خط، خود غالب نے لکھا، اور اس کی نشان دہی پہلی بار کمال احمد صدیقی نے کی......''

میں نے شکایت کی کہ اگر آپ کو مجھ سے اتفاق تھا، تو اب تک آپ خاموش کیوں رہے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے اتفاق نہ ہوتا تو میں اس پر اختلافی نوٹ لکھتا۔ خلیق انجم کی بات میں ذرا دیر میں کروں گا۔ ۱۹۸۷ء ہی میں میں نے پروفیسر آل احمد سرور کو بھی لکھا کہ وہ مجھ حقیر کے دلائل کو جانچیں۔ انہوں نے لکھا کہ میں توجہ سے آپ کی تحریر پڑھی، لیکن عرشی صاحب نے سوچ سمجھ کر ہی لکھا ہوگا۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اُس وقت جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے صدر تھے۔ ساری بحث رسائل میں اُن کی نظر سے گزری تھی۔ انہوں نے ڈائرکٹر آرکائوز کو ہماری زبان کا وہ شمارہ بھیج دیا، ایک خط کے ساتھ۔ میں خود بھی جا کر ڈپٹی ڈائرکٹر قمر احسن سے ملا، جو معروف افسانہ نگار ہیں اور مجھ حقیر کے نام اور کام سے واقف تھے۔ انہوں نے اور اُن کے عملے نے یقین دلایا کہ تحریر کے ماہر اسے جانچیں گے اور آپ کو فیصلے سے آگاہ کیا جائے گا۔ پروفیسر قدوائی نے ۲۷؍اپریل ۱۹۸۸ء کو خط لکھا تھا۔ آرکائوز نے مجھ حقیر سے مئی کے آخر میں کہا کہ آپ ایک طرح سے صاحب معاملہ ہیں، اس لیے درخواست آپ بھی دیں۔ ۳۱؍مئی کو مجھ حقیر نے بھی تحریری درخواست کا اضافہ کر دیا۔ لیکن ڈھاک کے تین پات۔ آرکائوز نے ۲۹؍جولائی کے خط میں اطلاع دی کہ وہ اس معاملے میں کچھ کہنے سے معذور ہیں۔

ان سب خطوں کے عکس حاضر ہیں۔

انجمن ترقی اُردو (ہند)
अन्जुमन तरक़्क़ी उर्दू (हिन्द) ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
Anjuman on the INTER-NET
URDU GHAR : Urdu Ghar Marg, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002.
Contact : 3237210, 3236299 Fax : 011-3239547 E-mail : urduadab@del.net.in
URDU ADAB (Quarterly) HAMARI ZABAN Weekly

۱۷ر اپریل ۲۰۰۳ء

کمال احمد صدیقی صاحب! آداب

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام دسمبر ۲۰۰۲ء کے اواخر میں غالب کی مکتوب نگاری پر سہ روزہ سمینار منعقد ہوا تھا، میں نے اس سمینار میں ''غالب کے جعلی خطوط'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا تھا۔ میں نے مقالے میں اس خط کا بھی ذکر کیا تھا جو غالب نے ۱۵ر جون ۱۸۶۸ء کو نواب کلب علی خاں کے نام لکھا تھا اور جس میں انھوں نے تاخیر سے جواب دینے کا یہ عذر پیش کیا تھا کہ:

''میں بیکارِ محض ہو گیا ہوں، مطلق کچھ نہیں لکھ سکتا اور کوئی ایسا شخص کہ جس سے کچھ لکھواؤں اس چار روز میں میرے پاس نہیں آیا۔ آج اس وقت ایک صاحب آ گئے، ان سے میں نے یہ عریضہ لکھوالیا''۔

عرشی صاحب مرحوم نے یہ خط ''مکاتیبِ غالب'' میں نقل کر کے اس پر حاشیہ لکھا کہ بیماری کی وجہ سے غالب نے یہ خط کسی اور سے لکھوایا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو عرشی صاحب کی ہر بات پر آمنا و صدّقنا کہتے ہیں۔ میں نے بھی یہی بات عرشی صاحب کے حوالے سے لکھ دی۔ آپ نے اس خط پر ایک مقالہ لکھا جو ''ہماری زبان'' کے ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ آپ نے اپنے مقالے میں تحریر فرمایا تھا کہ یہ خط خود غالب کے اپنے قلم سے لکھا ہوا ہے اور ''دل جمی'' کا املا جان بوجھ کر غلط لکھا گیا ہے۔ آپ نے بالکل صحیح لکھا تھا کہ خط کے حروف، دائروں، جوڑوں، کشش، نقطے اور اسلوبِ نگارش کا تجزیہ کیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ واقعی غالب کی تحریر ہے۔

میں نے آپ کے دلائل کی روشنی میں خط کے عکس کو کئی بار پڑھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے محترم عرشی صاحب مرحوم کو سہو ہوا تھا اور آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ جس طرح عرشی صاحب نے غالب کی

بات بغیر سوچے سمجھے قبول کر لی، میں نے بھی عرشی صاحب کے بیان کو غور کیے بغیر تسلیم کر لیا، جب کہ یہ حقیقت نہیں تھی۔ بات یہ ہے کہ غالب نواب صاحب کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ ان کی طبیعت اتنی خراب ہے کہ وہ خط لکھنے کے بھی قابل نہیں ہیں۔

میں نے سمینار میں یہ تسلیم کیا تھا کہ اس طرف پہلی بار آپ نے توجہ دلائی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ صرف زبانی گفتگو کافی نہیں ہے، اس حقیقت کا اعتراف تحریری طور پر کیا جانا ضروری ہے اسی لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

نیاز کیش

(خلیق انجم)

Dr. Kamal Ahmad Siddiqui

202, Munurka Vihar,

New Delhi-110067

जवाहरलाल नेहरु विश्वविद्यालय
JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY
NEW DELHI-110067

PROFESSOR S.R. KIDWAI
CHAIRPERSON
CENTRE OF INDIAN LANGUAGES

420/CIL/27/4/88

The Director,
National Archieves of India,
Janpath,
New Delhi

27.4.1988

Dear Sir,

Kamal Ahmad Siddiqi, a research scholar in this Centre has stumbled on a letter by the famous poet Ghalib, supposed to have been penned by someone else and signed by Ghalib on 15 June, 1868 The research scholar who is comparing the writing with other letters of - Ghalib has noticed many common characteristics. This letter was addressed to the Nawab of Rampur. Since clear photocopies of the letter under question are available, the originals may not be required for examination.

I shall feel grateful if your experts may evaluate the document and give their considered opinion about the authenticity.

Kindly indicate the name of the expert whom the research scholar may contact himself.

Thanking you,

Yours faithfully,

(S.R. KIDWAI)

Gram : JAYENU Tel. : 667676, 667557 Telex : 031-4967 JNU IN

[illegible]/106, Old Campus,
Jawaharlal Nehru University,
New Delhi 110067.
31.5.88.

The Director
of Archives,
Janpath,
New Delhi

Dear Sir,

This is in reference to your letter No. 7(6)/88-OR 2 dated 17.5.88.

I have been working on letters and the purpose is not to have the authenticity of Ghalib's writings verified, but to get expert opinion on the specimens of different letters ~~being~~ which have identifiable similarities in spite of NASKH, NASTALIQ and a mix of both.

Photostats of the specimens are attached.

Yours truly,

Kamal

(KAMAL AHMAD SIDDIQI)

फा0सं07(6)/88-बी0आर0-2
भारत सरकार
राष्ट्रीय अभिलेखागार
जनपथ, नई दिल्ली-1, दिनांक ____

सेवा में,

श्री कमाल अहमद सिद्दीकी,
रिसर्च स्कालर,
ब्लाक 1/106, ओल्ड कैम्पस,
जवाहरलाल नेहरू विश्वविद्यालय,
नई दिल्ली - 110067

महोदय,

आपका पत्र दिनांकित 31 मई, 1988 ग़ालिब के पत्रों की प्रतियाँ, किताबनुमा एवं हमारी ज़बान की प्रतियाँ सहित प्राप्त हो गया था ।

जैसा कि हम आपको अपने पिछले पत्र दिनांकित 17 मई, 1988 द्वारा सूचित कर चुके हैं कि गालिब के हस्तलिपि को जाँचने का कार्य इस विभाग की कार्यसीमा से बाहर है अतः हमें खेद है कि हम इस सम्बन्ध में कोई सहयोग देने में असमर्थ हैं । आप द्वारा भेजी गई सभी प्रतियाँ इस पत्र सहित वापस भेजी जा रही हैं ।

भवदीय
सैयद निसार अली जाफ़री
कृते अभिलेख निदेशक,
भारत सरकार ।

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں